toobaa-elibrary.blogspot.com

۷۸٦

اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا • بیشک بعض بیان جادو اثر ہوتے ہیں

قرآنی جواہر پارے

حصّہ اوّل

مکمل افادات غیر مطبوعہ

شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد عثمانی مفسر قرآن دیوبند (یوپی)

مرتبہ

استاد العلماء شیخ الحدیث مولانا محمد عبد القادر قاسمی فاضل دیوبند ملتان

ناشر

کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

فون نمبر ۳۳۸۴۱

toobaa-elibrary.blogspot.com

قرآنی جواہر پارے

درس قرآن (سورہ فاتحہ وبقرہ)

افادات

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

مرتبہ: شیخ الحدیث مولانا محمد عبدالقادر قاسمی

پیشکش: طوبیٰ ریسرچ لائبریری

toobaa-elibrary.blogspot.com

toobaa-elibrary.blogspot.com

اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا • بیشک بعض بیان جادو اثر ہوتے ہیں

قرآنی جواہر پارے

خلیل

مکمل افادات غیر مطبوعہ

شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد عثمانی مفسر قرآن دیوبند (یو۔پی)

مُرتبہ

اُستاد العلماء شیخ الحدیث مولانا محمد عبدالقادر قاسمی فاضل دیوبند مُلتان

ناشر

کُتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ مُلتان

فون نمبر ۴۳۸۴۱

toobaa-elibrary.blogspot.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

"طبع اوّل"

شعبان المعظم سنہ ١٤١٥ھ ۔ جنوری سنہ ١٩٩٥ء

کتاب ـــــــــ قرآنی جواہر پارے

افادات ـــــــــ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

مرتب ـــــــــ مولانا محمد عبد القادر قاسمی ملتانی

کتابت ـــــــــ محمد عبد السلام قاسمی

ضخامت ـــــــــ چھیانوے ٩٦ صفحات

تعداد ـــــــــ ایک ہزار نسخہ

قیمت ـــــــــ

ـــــ ملنے کے پتے ـــــ

١۔ مکان نمبر ٣٦٩ مسلم محلہ ٹبی شیر خان کچہری روڈ ملتان شہر۔

٢۔ "القاسم" ٢٩٣۔بی۔ ٧٠ فٹ روڈ شاہ رکن عالم کالونی ملتان شہر۔

٣۔ مدنی کتب خانہ، ٹی۔ ایل ہسپتال روڈ، نزد خیر المدارس ملتان شہر

٤۔ کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار، راولپنڈی۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

ج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

حضرات!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آج سے قریباً پچیس سال قبل یعنی ۱۳۶۰ھ / ۱۹۴۱ء کے دوران جب کہ احقر مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند ضلع سہارن پور (انڈیا) میں دورۂ حدیث میں شریک تھا۔ ان دنوں حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب مرحوم و مغفور دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم تھے۔

ہم طلبہ دارالعلوم کی درخواست پر حضرت ممدوحؒ نے سورۃ فاتحہ کے درس سے اپنے تفسیری موتیوں کا آغاز فرمایا۔ آپ کے یہ جواہر پارے متداولہ کتب تفسیر کا خلاصہ اور نچوڑ ہیں۔ جن کو احقر نے دورانِ درس منضبط کیا۔

حضرت ابن امیر شریعت سید مولانا ابو معاویہ ابوذر بخاری ﷺ کی تحسین اور آفرین پر عوام و خواص کے فائدہ کے لئے ان کے پندرہ روزہ رسالہ "الاحرار" میں قسط وار شائع کیا گیا۔ جو صرف مالک یوم الدین ﷺ تک طبع ہو سکا۔ احباب کا تقاضا تھا کہ اسے مکمل شائع کیا جائے۔ حضرت مولانا ابوذر بخاری بھی فالج کے مریض بن گئے۔ اور احقر بھی فالج کا مریض بن گیا۔ جس کی وجہ سے اشاعت کا سلسلہ بند ہو گیا۔

عزیزم محمد عبد السلام قاسمی ﷺ کے تعاون سے اس کی تکمیل کی توفیق ہوئی۔ کسی ادارہ کو

toobaa-elibrary.blogspot.com

اس کی طباعت کی ہمت نہ ہوئی۔

توکلاً علی اللہ ہم دونوں باپ بیٹا نے اس کا بیڑا اٹھایا۔ امید کہ علماء اور عوام ذوق قدردانی کرتے ہوئے اس کی اشاعت میں مکمل تعاون فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری مساعی جمیلہ کو قبول کرتے ہوئے اسے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین ثم آمین۔

تا زیست صحت کی دعا ہے۔

احقر العباد
محمد عبد القادر قاسمی
فاضل دیوبند

toobaa-elibrary.blogspot.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہر عمل کا مغز "نیت" ہے۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اَلَا اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ۔ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ۔

ترجمہ: یاد رکھو! انسان کے جسم میں گوشت کا ایک خاص لوتھڑا ہے، جب وہ درست ہو تو سارا جسم درست رہتا ہے۔ اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم خراب اور فاسد ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو! وہ لوتھڑا دل ہے۔

جیسے قلب اور جسد کا تعلق ہے۔ ایسے ہی نیت اور عمل کا بھی ہے۔ چنانچہ پہلی نظر میں عمل بہت اچھا ہو، مگر نیت فاسد ہو۔ جیسے "مسجد ضرار" کا تذکرہ قرآن مجید میں آتا ہے باوجود اس کے کہ فرمایا گیا مَنْ بَنٰی لِلّٰہِ مَسْجِدًا بَنَی اللّٰہُ لَہٗ بَیْتًا فِی الْجَنَّۃِ۔ جس شخص نے اللہ کے لئے مسجد تعمیر کی، اللہ اس کے لئے جنت میں گھر بنا دے گا۔ مگر اس پہ وعید آئی۔ "ابو عمر راہب" جو کہ اس کا بانی تھا اس کا لقب نبی علیہ السلام کے فرمانے سے بجائے "راہب" کے "فاسق" پڑ گیا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ "بہترین عمل" جس کے لئے جنت میں قصر تیار کیا جائے، اس کا "نیت کی خرابی" سے کیسا حال ہوا۔ اور دوسرا یہ کہ ظاہراً عمل بہت خراب ہو مگر نیت صحیح ہو۔ جیسے حضرت حاطب ابن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے کفارِ مکہ کی طرف آپ کی روانگی سے پہلے خط لکھا کہ "آپ سیلِ رواں کی طرح مکہ پر حملہ کرنے والے ہیں" حکومت ایسے آدمی کو قتل کر دیتی۔ چنانچہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت مقداد کو فرمایا کہ "باغ خاخ" کے نزدیک ایک بڑھیا جا رہی ہو گی۔ اس سے خط لے آؤ" خط لایا گیا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اور ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے اپنی معذرت بیان کی۔ کہ میں صلۂ رحمی کرنا چاہتا تھا۔ اُس کے متعلق یہ فرمایا گیا کہ۔ لَا تَقُوْلُوْا لَہٗ اِلَّا خَیْرًا۔ حاطب کو اچھائی کے سوا اور کچھ نہ کہنا۔ چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شاید تحقیق اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کو بخش دیا ہو۔ اور کہا کہ: اب قرآن مجید کے شروع کرنے کے لئے نیت یہ کرنی چاہیئے کہ جتنے خیالات و افکار رہیں ہمیں اُن کو بالائے طاق رکھ کر اُن کو قرآن کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے کیوں کہ کوئی رائے، کوئی فکر، کوئی اجتہاد، حجت نہیں۔ مگر صرف "ایک قرآن" ہی ہے کہ جس کے اتارنے والے کے علم میں غلطی کا شائبہ ہی نہیں اور لے آنے والا ایسا فرشتہ ہے کہ جس کے متعلق فرمایا گیا۔ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ۔ یہ قرآن ایک بزرگ فرشتہ کی لائی ہوئی بات ہے۔ جس پر لایا گیا اس کا یہ حال ہے۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى۔ نہیں بھٹکا تمہارا ساتھی اور نہ ہی بہکا ہے۔ آپ کے اندر چالیس برس کی عمر میں کوئی خیانت وغیرہ نہ پائی گئی اور یہ منزل علیہ ایسا ہے کہ اس پر کوئی غلطی اور نقصان کا احتمال تک بھی نہیں تو اسی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے اور اپنے جذبات کو اُس کے تابع کرنا چاہیئے۔ جیسے بدر کی لڑائی کے لئے صحابہ کا جذبہ تھا اور حدیبیہ کے دن ذرا تشویش ہونے لگی۔ اُن ہی کی طرف اشارہ کیا گیا کہ۔ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ۔ صلح حدیبیہ کے وقت اللہ نے اہلِ ایمان پر سکینہ نازل کی تاکہ وہ ایمان میں اور ترقی حاصل کر لیں۔

۲- "سورۃ فاتحہ" اگرچہ مختصر ہے مگر "مضامین عالیہ" اور اہم مقاصد پر مشتمل ہے جس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ میں تم کو ایک سورۃ ایسی نہ بتاؤں کہ جو عظیم سورۃ ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنُ الْعَظِيْمُ۔ وہ سات بار دہرائی جانے والی آیات کا مجموعہ اور قرآن عظیم کا خلاصہ ہے۔ آپ نے اسی سورۃ کو سبع مثانی اور قرآنِ عظیم فرمایا۔ لیکن عظمت باعتبار کیفیت و اوصاف کے ہوتی ہے نہ کہ صغر و کبر باعتبار مقدار کے ہوتا ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا کہ یہ قرآنِ عظیم ہے۔ اس کے کئی نام ہیں اُن میں سے ایک "اُمّ القرآن" اور "اُمّ الکتاب" اور "فاتحۃ الکتاب" ہے۔ اُمّ القرآن کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ "اُمّ" باعتبار اصل عربی کے ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو "جامع الامور" ہو اور اُن سے "مقدم" ہو اور اس کے لئے "توابع" ہوں۔ جو کہ اس کے پیچھے آئیں۔ یہ معنی ابن جریر نے بیان کیے ہیں۔ چنانچہ والدہ کو "اُمّ" بھی اسی لئے کہا جاتا ہے۔ مگر امام راغب اصفہانی نے یہ معنی لکھے ہیں کہ "اُمّ" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کے وجود کی یا تربیت کی یا اصلاح کی جڑ ہو اور اس کا مبدا ہو۔ عام طور پر اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ فاتحہ ترتیب مصحف کے اعتبار سے مقدم ہے اور تلاوۃ و صلوٰۃ

toobaa-elibrary.blogspot.com

بھی مقدم ہوتی ہے۔ اسی لئے اسے "ام القرآن" کہتے ہیں۔ مگر یہ کافی نہیں کیوں کہ "ام" جڑ کو کہتے ہیں اور محققین کہتے ہیں کہ قرآن جتنے حقائق و مقاصد پر مشتمل ہے۔ اُن سب کا تخم یہی سورۃ ہے۔ جیسے گٹھلی سے درخت کا نشو و نما ہوتا ہے۔ گویا تخم وجود اجمالی ہوا اور درخت وجود تفصیلی ہوتا ہے اسی طرح جتنے مقاصد و حقائق قرآن مجید پر مبعوث ہوتے ہیں اُن کا نچوڑ اسی میں ہے۔ قرآن مجید کے اصول و مقاصد کے انواع جن پر وہ مشتمل ہے۔ وہ یہ ہیں۔ "ضرورت قرآن" یعنی تمام دنیا کو اس کی کیوں ضرورت ہے۔ اس کا اثبات۔ قرآن ایک وحی ہے۔ مگر وحی کا انحصار قرآن مجید پر نہیں ہے۔ جیسے کتب سابقہ سماویہ۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وحی کو جو کہ عام ہے۔ اس کی انسانوں کو ضرورت ہے۔ اُس کا توقف اس پر ہے کہ انسان کی فطرت کو بلکہ تمام عالم پر نظر ڈالی جائے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ فطرت انسانیت کس چیز کی مقتضی ہے۔ ان مخلوقات میں سے بعض مخدوم ہیں اور بعض خادم ہیں۔ تو جتنی مخلوق ہے اُس پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کی ضرورت ہے جیسے زمین، بارش، شمس وغیرہ۔ مگر صرف ایک نوع انسان ہے کہ یہ دوسروں سے کام تو لیتا ہے۔ مگر یہ کسی کے کام نہیں آتا کہ انسان کے چلے جانے سے زمین، سمندر وغیرہ کو اس سے کوئی مضرت نہیں ہوتی۔ اگر انسان ہوا اور یہ اشیاء نہ ہوں۔ پہلے تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا اگر رہے گا تو تکلیف اور مصیبت میں رہ کر۔ الغرض تمام مخلوق میں ہر ایک دوسرے کے کام آتی ہے۔ مگر ایک انسان ہے کہ وہ خدمت تو لیتا ہے۔ مگر کسی کی خدمت کرتا نہیں۔ البتہ خدمت لیتا یا تو اپنی قدرت سے ہے یا قدرت خداوندی کی وجہ سے اس کے کام آتی ہے۔ جیسے شمس و قمر فرمایا گیا کہ "وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ" اور اللہ نے تابع کر دیا ہے۔ تمہارے لیئے سورج اور چاند کو اور بادل وغیرہ کو تو جب یہ مخلوقات کے کام کا نہیں اور اس کے سوا یہ ایک خالق ہے۔ تو ضرور اس کے کام آئے گا۔ اگر اس کی خدمت نہ کرے تو باغی ہوگا۔ تو جب خالق کا محکوم و خادم ہوا تو اب ہمیں وہ کام تلاش کرنا چاہیئے کہ جس کی وجہ سے تخلیق ہوئی۔ اس کے خزانہ میں تو سب چیزیں تھیں۔ مگر ایک چیز نہیں تھی۔ جو اس انسان کی وجہ سے ہو سکتی تھی۔ اس لئے پیدا کیا گیا۔ وہ چیز کہ جس کی وجہ سے باری تعالےٰ راضی ہو جائے تو لازم ہوا کہ اس کے مرضیات کو طلب کیا جائے۔ مگر وہ معلوم نہیں ہو سکتے تھے۔ جب تک کہ وہ ذات خود ان کا اظہار نہ کرے۔ اُس کے اظہار کی ایک تو یہ صورت ہے کہ ہر ایک کو الگ الگ بتادے یہ تو خالق کی رفعت و جلالت کے خلاف ہے۔ اور ایک صورت یہ بھی ہے کہ اپنے کسی قریب کے ذریعہ سے اپنے مرضیات اور غیر مرضیات کا اظہار کر دے۔ کیوں کہ ہر عقل انسانی جو کہ ایک اندرونی روشنی ہے

toobaa-elibrary.blogspot.com

اور اس کی مثال آنکھ کی طرح ہے۔ اس کے لئے ایک باہر کی روشنی کی ضرورت تھی کہ جس یعنی روشنی میں وہ عقل ان امور کو دیکھ سکے۔ جیسے علوم و فنون مثلاً بدن کی صحت و مرض کے لئے قانونِ حکمت کی ضرورت ہے اور ایسے ہی نظریات منطق کی ضرورت ہے۔ غرض یہ کہ سب قانون ایسے ہیں کہ یہ عاصم (خطا سے بچانے کا ذریعہ) تو ہیں۔ مگر معصوم (خود بے خطا) نہیں۔ کیوں کہ ان میں بہت اختلاف ہے۔ اور ان کے متعلق بہت سی غلطیاں ہو جاتی ہیں مگر یہ غلطی دنیاوی و معاشی اشیاء نہیں ہے۔ جس میں غلطی کوئی چنداں خطاء نہیں۔ مگر معرفتِ حق تعالٰے میں تو ایسے قانون کی ضرورت ہے کہ وہ عاصم اور معصوم ہو تو وہ بغیر وحی کے اور کوئی چیز نہیں۔ کیوں کہ وہ عاصم و معصوم ہے جو ایسی ذات ہے کہ خالق و قادر ہے اور جس پر نازل ہوئی۔ وہ بھی مبرا من الرذائل (عیوب سے پاک ذات) ہے وغیرہ تو عقل کو روشنی کی ضرورت تھی اس لئے باری تعالٰے نے اتمامِ حجت کے لئے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا اور کتب سابقہ کو نازل کیا گیا۔ اس زمانہ کے طبائع اور امزجہ کے موافق اور مطابق نازل کیا گیا۔ مگر اس قانون کی حفاظت کا ذمہ نہیں اٹھایا گیا۔ ان کے حق میں فرمایا گیا کہ وہ حافظ بنائے گئے۔ اپنے آپ کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا۔ بندہ کی ذمہ داری چوں کہ ناقص ہے۔ اس لئے وہ محفوظ نہیں رہ سکتی۔ لیکن قرآن مجید کے متعلق اس کی حفاظت کا ذمہ لیا گیا۔ وجہ یہ ہے کہ ان سابقہ کتب کو باقی رکھنا مقصود نہ تھا۔ کیوں کہ اگر مقصود ہوتا تو پھر اور کتاب کے نزول کی کیا ضرورت تھی۔ مگر علم الٰہی میں تھا کہ عالم میں ترقی ہونے والی ہے۔ اُن کے قوی فکریہ وغیرہ عالم اوج پر ہو گئے۔ اس لئے ان کے طبائع کے مطابق نازل کیا گیا۔ تو معلوم ہوا کہ انسانی عقول کو تربیت دی گئی ہے۔ اور انہیں عالم شباب تک پہنچایا گیا ہے۔ آج کل کے ایجادات کو دیکھ لیجئے۔ کہ اگر اس زمانہ میں ان میں سے کسی کے متعلق کچھ کہا جاتا۔ تو دیوانہ اور پاگل کہلاتا۔ جیسے انسان کی ابتدائی عمر کو دیکھا جائے کہ تدریجی ترقی کی وجہ سے لباس وغیرہ میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ مگر وہ جب عالم شباب پر پہنچ جاتے۔ تو اگر اس کے لئے ایک ایسا لباس بنایا جائے جو پھٹا اور پرانا نہ ہو۔ تو اس کے لئے اور لباس کی ضرورت نہیں۔ ایسے ہی نوع انسان کی تدریجی ترقی کا حال ہے کہ باقی کتب تو اس کے ابتدائی زمانہ کے لئے تھیں۔ مگر ایک ایسا قانون جو اس کے لئے بڑھاپے اور موت تک کام دے۔ وہ صرف قرآن ہے۔

چنانچہ بڑے بڑے عقل مند اگرچہ اُن کا مذہب اور ہے۔ اس کہنے پر مجبور ہیں کہ اگر کوئی مذہب حق ہو سکتا ہے تو وہ اسلام ہو سکتا ہے۔ تو جب عالم کی ترقی علم باری تعالٰی میں کمال پر پہنچ گئی۔ تو ایک قانون بھیجا گیا اور نظریات میں سے ایک نمونہ کا ہونا ضروری تھا۔ اس لئے صحابہ کرام کو عالم دنیا کی طرف بھیجا گیا۔ چنانچہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہندوستان میں قیام و رہائش کے وقت تکالیف سے اپنے گورنروں اور دوستوں کو نصیحت کی کہ دونوں چیزوں کے جامع بادشاہ مصحف کو کبھی نہ چھوڑیں۔ جب انہیں کسی سرزمین کو فتح کرو تو ایک عملی نمونہ کا صحیفہ ضروری تھا اور یہ کتاب ایسی ہے کہ جتنے حقائق مبتوتہ ان کتب سابقہ میں تھے۔ ان کو اس میں جمع کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ ایک سو چار کتب تھیں جو کہ وقت کی مصلحت پر نازل ہوئیں ان کو اسی عالم دنیا کے قانون میں جمع کر دیا گیا۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمیں کس طرح معلوم ہو کہ قانون الٰہی ہے۔ اللہ اور اس کے طرح کے امور و اشیاء میں امتیاز کا طریقہ یہ ہے کہ جو کام کوئی آدمی کرے اس کے مقابل دوسرا کر سکتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی ترقی کر جاتا ہے مگر خدا وند کے کام ایسے ہیں کہ اگر ابتداء عالم سے لے کر انتہاء عالم تک کے لوگ جمع ہو جائیں تو خدا کی زمین جیسی چیز پیدا نہیں کر سکتے اسی لئے باری تعالیٰ نے آپ فرمایا

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ
تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ
(پ۲ ع۴ س۲ سورہ ع ۴)

ترجمہ۔ تحقیق آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور کشتیوں جہازوں میں جو سمندر میں چلتے ہیں بڑی نشانیاں ہیں

تو جیسے اس کے کام کو دوسروں کے کام سے پہچانتے ہیں۔ ایسے ہی اس کے کلام کو بھی دوسروں کے کلام سے پہچانا جائے گا جنانچہ قرآن اترا تو تحدّی کی کہ اگر کسی کو طاقت ہے تو ایک چھوٹی سی آیت لائے مگر نہیں لا سکتے حالانکہ بڑے بڑے شعراء موجود تھے۔ عرب بھی بڑے دعوے میں اور رئیس ہیں۔ مگر ایسے کلام کے لانے سے عاجز ہیں۔ تو لازمی طور پر اسے کلام اللہ کہا جائے گا۔ اور اسی کی ہمیں ضرورت تھی جس سے مرضیات الٰہیہ وغیرہ مرضیات معلوم ہو سکتے ہیں قرآن جن مقاصد کے لئے نازل ہوا ہے ان کے انواع پانچ ہیں

۱۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے افعال اور توحید کا بیان جسے ایمان کہا جاتا ہے یعنی مدرس ہستی کے متعلقات جن کی وجہ سے ذات باری تعالیٰ تمام صفات کمالیہ کے ساتھ مستجمع ہے۔ اگر ذات الٰہی کو تمام صفات کمالیہ کا مستجمع نہ مانا جائے تو نعوذ باللہ اس میں نقص لازم آئے گا۔ یہ توحید اور معرفۃ الٰہیہ کہلائے گی۔ جیسے سورۃ اخلاص کہ اسی میں تمام صفات بیان کئے گئے ہیں چنانچہ ایک صحابی کا واقعہ صحیح بخاری میں آتا ہے۔ کہ وہ سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ اخلاص پڑھتے تھے۔ اور اس کے بعد اور کوئی سورۃ

toobaa-elibrary.blogspot.com

پڑھتے تھے۔ یہ ماجرا نبی علیہ السلام کی جناب میں گیا تو صحابی نے فرمایا کہ میں اسے توحید کی وجہ سے محبوب سمجھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ صفۃ الرحمٰن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسی سورۃ ہے کہ صرف صفات پر ہی مشتمل ہے یہ اسی سورۃ کی خصوصیت ہے۔

۲۔ توحید ذاتی صفاتی۔ افعال الغرض بہت سی عبادات کا ذکر اور وہ چند امور خواہی کے امتثال کا نام ہے اور وہ نہایت درجہ کا تذلل ہے غرض یہ کہ جن عبادات کا بلا واسطہ جناب باری تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہے وہ مراد ہیں۔

۳۔ تفصیل سعادت و شقاوت یعنی وہ عبادات جن کا بالواسطہ تعلق باری تعالیٰ کے ساتھ ہو۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ۔ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلَى رَبِّكَ فَارْغَبْ ٥ (پ ۳۰ الم نشرح)

ترجمہ۔ جب آپ فارغ ہوں تو اللہ کی عبادت کے لئے جم جائیے اور اپنے پالنہار کی طرف لگا دیکھئے۔ تحقیق ہے اس کا یہی معنی بیان کیا ہے کہ رغبت الی اللہ بلا واسطہ ہو پہلے بالواسطہ تھی کیونکہ آپ کے تمام افعال وہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے تھے۔ سعادت کے معنی یہ نہیں کہ فقط جنت کا دخول ہو۔ بلکہ جیسے یہ ہے ایسے ہی وہ امور دنیاوی بھی ہیں۔ جن کے نتیجہ میں سعادت ہے۔ جیسے سیاست وغیرہ۔ تمکین فی الارض، استقلال وغیرہ۔ الغرض وہ طریق بیان کئے جائیں گے جو سعادت دنیاوی و اخروی یا ان کی شقاوت کے ساتھ متعلق ہیں۔

۴۔ وعد و وعید یا تبشیر و انذار ترغیب کے ساتھ۔

۵۔ قصص۔ خواہ منعم علیہم کے ہوں۔ یا مغضوب علیہم کے ہوں۔ ان کا بہت بڑا حصہ قرآن مجید میں ہے حتیٰ کہ بعض کہتے ہیں کہ اگر قرآن کو چار حصص میں تقسیم کیا جائے تو تین حصہ قصص کے ہیں۔ احکام وغیرہ تو عبادات اور سعادت و شقاوت میں داخل ہیں۔ ان قصص کے بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ وہ قانون بھی بتلائے اور ان پر چلنے کا جذبہ اور ولولہ پیدا کرے۔ بخلاف دیگر حکومتوں کے قوانین کے کہ وہ خشک قوانین ہیں مگر قرآن مجید نے ایک قانون بتلایا اور چونکہ اللہ تعالیٰ رحمٰن اور شفیق ہیں۔ اس لئے احکام پر عمل کرنے کے بعد ان کے نتائج بھی بتا دیئے۔ حکمت تو اس میں تین درجات ہوتے۔ ۱۔ "حکم" ۲۔ پھر اس کی "حکمت" ۳۔ طاقۃ کا جذبہ۔ کہ متقدمین کی تاریخ پڑھنے سے دل میں جذبہ پیدا ہو جائے۔ کیونکہ یہ فطرت انسانیت ہے۔ کہ انسان ظاہر دستور دیکھ کر اپنے آپ کو ویسا ہی دیکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ جرمن کا ایک واقعہ ایک معتبر آدمی نے بیان کیا کہ جرمنی کے فوجیوں کو سورۃ انفال رٹ کر کے سنائی جاتی ہے۔ کیونکہ ان کا قول ہے کہ دنیا

toobaa-elibrary.blogspot.com

میں ہوتی ہیں۔ اصل میں رب العالمین کے سوا کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتی خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے۔ [illegible]

۲۔ سورۂ فاتحہ میں توحید و ایمان باللہ: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے مستفاد ہے کیونکہ حمد پر جو الف لام استغراق کا ہے یعنی حمد کا کوئی فرد باقی نہیں رہا۔ تو جس نے یہ کہا کہ سارے کمالات اللہ ہی کے لئے ہیں تو اس نے یہ کہا کہ تمام صفات کمالیہ بھی اسی کے لئے ہیں اور مستغرق [illegible] بعض علماء حمد سے شکر کے معنی مراد لیتے ہیں۔ تو معنی یوں ہوں گے کہ تمام نعمتیں اللہ [illegible] ہیں کہ وہ علم حاصل ہوا ہے [illegible] ذات کا جو [illegible] حمد کہا گیا تو اس میں توحید ذاتی درحقیقت یہی بیان کر دی گئی [illegible] خصوصیت کے ساتھ بیان کیا گیا۔ ربوبیت [illegible] عامہ اور ملک [illegible] تمام حقیقتیں [illegible] بیان کیا گیا تو توحید ربوبیت [illegible] ایاک نعبد سے بیان کیا ہے تو اس جگہ ایک [illegible] کسی مخلوق کو قدرت مستقلاً حاصل نہیں جب تک دوسرے کی توفیق نہ ہو تو اس سے [illegible] مستعین [illegible] تو معلوم ہو [illegible] ہم نے ایاک [illegible] کے تابع میں دوسری عبادت تھی [illegible] بیان کی گئی چوتھی [illegible] سعادت کی سبیل ہے وہ "اھدنا الصراط المستقیم" سے بیان کیا گیا کہ جس پر چلے [illegible] نہیں وہ [illegible] کا مقرر شدہ راستہ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا [illegible] صراطی مستقیما [illegible] اس میں سعادت دنیاوی و اخروی دونوں داخل ہیں۔ چوتھی چیز وعدہ وعید ہے۔ وعدہ "رحمن" [illegible] سے معلوم ہوتا ہے اور وعید "مالک یوم الدین" میں ہے تو دونوں وعدہ وعید [illegible] ہو سکتے ہیں جب کہ دین کو معنی "جزا" کے لئے لیا جائے۔ "انعمت" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تین قسم کے لوگ کرتے ہیں "منعم علیہ"، "مغضوب" اور "ضالین" کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو قسم کی قوتیں رکھی ہیں "قوت علمیہ" و "عملیہ"۔ علم کے حاصل ہونے کے ذرائع قوت حافظہ اور ادراک وغیرہ سب [illegible] ہے جیسے کوئی شخص کسی شہر کی طرف جائے اور اسے راستہ میں کوئی چیز دیکھے۔ تو پہلے سے دیکھتا اور غور کرے کہ آیا یہ چیز میرے مقصد کی ہے یا نفع کی۔ جب اس کو یقین ہو گیا کہ یہ شیر ہے اور اس کے پاس ہتھیار وغیرہ نہیں ہیں۔ تو اس علم کے اعتبار سے اس پر ایک خوف طاری ہوگا جو ارادہ کے لئے محرک ہے گا ارادہ قدرت کو تحریک دیتا ہے پھر جوارح کام کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ واقع میں صحیح ہو یا نہ ہو۔ مگر علم کی وجہ سے یہ سب کچھ کرے گا اور یہ علم کبھی خوف اور کبھی شوق پیدا کرتا ہے۔ علم کا تعلق تو عقل اور حواس سے ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

باقی تمام حواس یعنی لذت اور قسمت وغیرہ اس کے ساتھ قوتِ عملیہ ہوگی۔ تو مُنعَم علیہم وہ لوگ ہوں گے، جن کی قوت علمیہ بھی ٹھیک ہو اور قوت عملیہ بھی کہ اُن کے اعمال صحیح ہوں جیسے اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ تو اس میں جملہ انبیاء، صدیقین، شہداء، صلحاء وغیرہ آگئے۔ اگر کسی شخص کی قوتِ علمیہ تو صحیح ہو مثلاً سود کھانا ناجائز قرار دیتا ہے، مگر عمل اس کے خلاف کرتا ہے۔ اور ایک وہ شخص ہے کہ جس کا علم ہی صحیح نہیں مثلاً غیر اللہ کو مسجود بنائے تو وہ علم بھی غلط اور عمل بھی۔ اور ایک شخص ایسا ہوتا ہے کہ جس کا علم صحیح نہ ہو اور اس پر عمل صحیح کرتا جائے۔ تو پہلی قسم کے لوگ تو مغضوب علیہم ہیں کہ جن کو علم تو ہو مگر عمل نہ ہو اس پر غصہ بہت آتا ہے۔ یہ وصف یہود میں بہت پائی جاتی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ

يَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا يَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ۔ یہود میرے رسول کو بخوبی پہچانتے ہیں، جیسے کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔

اور اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو کہا "لَقَدۡ عَلِمۡتَ" بے شک تحقیق تو جانتا ہے۔ دوسری قوم وہ ہے جس نے صحیح راستہ کی جد و جہد کی تو بھٹک گئے یہ "ضَآلِّيۡنَ" ہیں۔ ہر ایک اصول قصص تھا وہ خواہ کیسے ہی ہوں، یا تو وہ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ میں داخل ہوں گے، یا مَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ میں یا ضَآلِّيۡنَ میں داخل ہوں گے۔

۳- یہ سورۂ فاتحہ "اُمّ القرآن" ہوئی اور اس کا خلاصہ ہوئی کیونکہ یہ تمام مضامینِ قرآنیہ کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام آنحضرت کے پاس تشریف لائے اور اسلام و ایمان اور احسان کے متعلق سوالات و جوابات ہوئے تو جیسے اس سورۂ فاتحہ کو "اُمّ القرآن" کہا جاتا ہے، اور علماء نے کہا کہ ایسے ہی حضرت جبرئیل علیہ السلام والی حدیث بھی اُمّ السنّۃ ہے کیونکہ یہ مضامین اس میں پائے جاتے ہیں جیسے اس سورۂ فاتحہ میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایمان تو اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ وغیرہ میں ہے اور اسلام اِيَّاكَ نَعۡبُدُ میں اور احسان کی طرف۔ اس خطاب سے لطیف اشارہ ہے۔ اور قیامت کی طرف "یوم الدین" سے اشارہ ہوا تو اُمّ السنّۃ بھی اُمّ القرآن پر منطبق ہوگئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ نماز میں اس سورۂ فاتحہ کو "موقوف علیہ" قرار دیا گیا۔ ورنہ ہمارے لئے سارا قرآن پڑھنا تو بہت دشوار تھا۔ اس لئے اجمال تو پورا کرا دیا۔

تفصیل کے لئے فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ (سو پڑھو تم جتنا آسان ہو قرآن سے) فرمایا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

ملا یہی وہ سورۃ ہے۔ کہ اسی کو ترتیبِ مصحف میں مقدم رکھا گیا اور نزول میں سب سے پہلے کیسے اس میں اختلاف ہے۔ بعض سورۃ اقرأ کو اور بعض سورۃ مدثر اور بعض سورۃ فاتحہ کو کہتے ہیں مگر وہ تھوڑے ہیں۔ البتہ ایک حدیث مرسل میں ہے کہ سب سے پہلے جب جبرائیل علیہ السلام آئے۔ تو فرمایا کہ بِسْمِ اللّٰہِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ اگر تعارض نہ مانا جائے۔ اور کہا جائے کہ "اقرأ" اور سورۃ فاتحہ دونوں کو ایک مجلس میں پڑھا گیا ہوگا۔ جیسے ایک اور روایت میں ہے کہ جب جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا "اقرأ" تو آپ نے فرمایا۔ کیف اقرأ میں کیسے پڑھوں، اور اس حدیث میں ہے کہ قُلْ بِسْمِ اللّٰہِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" تو گو یہ تقدیم ذاتی "اقرأ" کو ہو۔ مگر تقدیم عرضی سورۃ فاتحہ کو حاصل ہو۔ تو جامع کی یہ صورۃ ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہ تقدیم عرضی بھی ہوگی۔ جیسے سورۃ مدثر اور اقرأ میں تطبیق دی جاتی ہے۔ کہ فترت ترکِ وحی کے زمانہ کے بعد سورۃ مدثر سب سے پہلے نازل ہوئی۔ بہرکیف سورۃ فاتحہ قرآن مجید کا خلاصہ ہے۔

اور اس سورۃ فاتحہ کی آخری چار آیات پہلی تین آیات پر مرتب و متفرع ہیں۔ "الحمد للہ" اس میں لفظ "اللہ" ایک ایسی ذات کا نام ہے جو وجود اور تمام صفات کمالیہ کے لئے سرچشمہ اور خزانہ ہے یعنی عالم میں وجود کی کوئی نوع و درجہ کہیں بھی ہو یا کمال و جمال کا کوئی ذرہ و شائبہ کہیں بھی ہو۔ وہ سب اسی ایک "خزانہ غیب" اور خاندان میں سے ہے۔ مثلاً آفتاب اپنی شعاعوں کے ذریعہ سے عالم کائنات کو منور کرتا ہے۔ علی حسب استطاعت آفتاب میں تو کوئی بخل نہیں۔ مگر اس استعداد و قابلیت کے اعتبار سے ہر چیز اپنی قابلیت کے مطابق نور حاصل کرتی ہے۔ اور یہ تمام پھیلی ہوئی روشنی اور نور جب کہ آفتاب زمین سے تقریباً نو کروڑ میل کے فاصلہ پر ہے۔ قصہ یہ آفتاب کا ہے، اور وہی مخزن ہے۔ اس کے طلوع کے وقت کو کوئی روک نہیں سکتا۔ ایسے ہی غروب کے وقت کو کوئی لا نہیں سکتا۔

الغرض ﷺ وہ منبع ہے، مثال تفہیم کے لئے ہے۔ ایسے ہی ذاتِ باری تعالیٰ سب کمالات و جمالات کا منبع و مخزن ہے۔

"اے برون از وہم وقیل وقال من"

تو جب کمال سوائے اس ذاتِ باری کے کسی کے لئے ہے ہی نہیں۔ تو پھر وہ حمد کس کے لئے ہوگی۔ تو تمام منبع ہو گئے جنس حمد و حمد فرد حمد کے لئے جو مختص ہیں ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے اور جب تمام معلوما کی باگ اس کے قبضہ میں ہے۔ تو تعبد و عبادت کا اور کون مستحق ہو سکتا ہے اس کے لئے فرمایا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِي رَبًّا وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ‎ (سورۃ [illegible] پ ۸ [illegible])

ترجمہ۔ تم کہو۔ کیا رب اللہ کے سوا کسی اور کے متعلق مجھے بتلاتے ہو کہ اسے پوجوں اسے نا دانو۔

اور خصوصاً جب وہ سارے عالم کا رب ہو۔ رب کے معنی امام راغب نے یہ بیان کیے ہیں کہ رب ایسی ہستی کا نام ہے جو کسی شے کو اس کی حد کمال تک شیئاً فشیئاً پہنچائے جو کمال اس کے لیے لائق ہے۔ سے رب کہا جائے گا۔ تو رب العالمین کے معنی یہ ہوئے کہ جتنے قلوب دانشیں ہیں سب کو حد کمال تک پہنچانے والا جو کمال اس کے لیے لائق ہے۔ جیسے ماں باپ بچے کی تربیت کرتے ہیں اور تدریجی اس کے مناسب حال تربیت دی جاتی ہے یہ نہیں کہ اول ہی پلاؤ کھلایا جائے یا فوراً بخاری کے درس میں بٹھا دیا جائے بلکہ پہلے صورت پھر چھوٹے چھوٹے جملے سکھائے جاتے ہیں ایسے ہی مرشد اور استاد کی روحانی تربیت ہے تو رب العالمین کا معنی یہ ہے کہ جو عالم کی ہر چیز کو اور ہر مخلوق کو حد کمال تک تدریجاً پہنچائے۔ تو جیسے اس کی ربوبیت کاملہ ہے ایسے ہی سامنے عبودیت بھی کامل ہونی چاہیئے۔ جیسے فرمایا گیا۔

أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ‎ (سورۃ [illegible] پ ۲۳ [illegible])

ترجمہ کیا تم پکارتے ہو۔ بعل (بت) کو۔ اور چھوڑتے ہو سب سے بہتر بنانے والے کو۔

الرحمٰن الرحیم یہ دونوں نام وال ہیں۔ ایسی رحمت پر کہ جو وسیع ہے۔ اس میں کسی قسم کی تنگی کا مفہوم نہیں اور اس نے ذرہ ذرہ کو گھیر رکھا ہے کوئی کلی وجزئی رحمت اور دنیاوی واخروی رحمت اس کے دائرہ سے باہر نہیں ہو سکتی۔ جیسے فرمایا گیا۔

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ‎ (پ ۹ [illegible]) میری رحمت وسیع ہے

تو اسی ذات کی عبادت اور اسی کی ہی تابع داری کرنی چاہیئے۔

مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ یعنی یوم جزا کا مالک "یعنی خیر و شر اور ہر کے بدلہ نتائج کا جو مالک ہو۔ اس کی عبادت کرنی چاہیئے۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو فرمایا۔

قَالَ أَفَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ ‎ ([illegible])

ترجمہ۔ کیا تم پوجتے ہو اللہ کے سوا ان چیزوں (بتوں) کو جو تمہارے لئے کسی نفع اور نقصان کی مالک نہیں ہیں

تو الحمد للہ کا ترتب ان سب کلموں پر ہے۔ ایسے ہی ایاک نستعین کا ترتب بھی ان

toobaa-elibrary.blogspot.com

جملوں پر ہے کہ جو ذات نفع و ضرر و تربیت وغیرہ کی مالک ہے اور مستعان ہے قبضہ کامل شرط ہے اگر مالک ہو لیکن اس میں رحم نہ ہو تو وہ کیسے مدد کر سکتا ہے وہ تو ڈبو دے گا اگر وہ مالک بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ مگر تربیت کی طرز سے واقف نہیں۔ تو وہ خاک استعانت کرے گا اور یہ سب شرائط ذات باری میں پائی جاتی ہیں اور استعانت کے قابل وہی ذات ہے۔ تو مستعان کے لئے تربیت اور حکمت رحمت ہونی چاہئے۔

اس طرح سے اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا ترتب اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ پر ہوا اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا رَبِّ الْعٰلَمِیْن اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ کا ترتب الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پر ہے کیونکہ جو ہاتھ پکڑ کر منزل مقصود تک پہنچائے گا وہ غایت کا مہربان ہوگا۔ اور آگے کی تمام آیات کا ترتب مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن پر ہے اور اگر تین صفات میں سے فقط الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کو لیا جائے تو سب کا ترتب اسی پر ہوگا کیونکہ جب شفقت و رحمت کامل ہوگی تو ربوبیت بھی کامل ماننی پڑے گی۔ ایسے ہی جو نفع و ضرر کا مالک ہے وہ ضرور رحمٰن و رحیم ہوگا۔

الغرض رحمت کے کوئی چیز ظہور ہی نہیں کر سکتی۔ جب تک رحمت کا ورود ہو۔ جتنا رحمت زیادہ ہوگی اتنی ہی وہ چیز کامل ہوگی تو پھر ان سب کا ترتب بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم پر ہوگا کیونکہ اللہ تو اسم ذات ہے۔ اور باقی تمام چیزیں رحمت کا مظہر ہیں اس سے بے نقصان ہو سکتا ہے تو ان تمام آیات کا ترتب بھی الرحمن الرحیم پر ہوا اگر یوں کہا جائے کہ تمام قرآن عالم کبیر ہے اور سورۃ فاتحہ عالم صغیر ہے بس بسم اللہ کو حرز ماننا مناسب ہے کہ قرآن کی کوئی بھی سورۃ پڑھو تو اس کا خلاصہ اس میں درج ہے بس یہ حضرات بسم اللہ کو سورۃ کا جزو قرار نہیں دیتے۔ بلکہ مستقل آیت کہتے ہیں اگر بسم اللہ کا خلاصہ کرنا ہو تو وہ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ ارسال رسل اور نزول قرآن کا مقصد اصلی یہ ہے۔ کہ عبد و معبود رحمٰن و مرحوم رب و مربوب میں تعلق صحیح پیدا ہو جائے۔ اس تعلق کو صحیح بنانے کے لئے انبیاء کو اور کتب سماویہ کو نازل کیا گیا اور وہ تعلق یہ ہے کہ انسان اس کی ذات اور صفات کے ساتھ چمٹ رہے۔ بسم اللہ کی باء کو علامہ زمخشری تو مصاحبۃ اللفظ والمعنی کو ساتھ ملانے اور جوڑنے کی قرار دیتے ہیں اور قاضی بیضاوی "باء" استعانت کی کہتے ہیں۔ مگر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی باء "الصاق" کی قرار دیتے ہیں اور وہ الصاق ایک تو حقیقی ہوتا ہے۔ جیسے مَسَحْتُ بِرَأْسِیْ۔ میں نے اپنے سر کا مسح کیا اس پر ہاتھ پھیرا۔ اور ایک حکمی ہوتا ہے۔ جیسے مَرَرْتُ بِزَیْدٍ میں زید کے پاس سے گزرا، تو جب تک انسان ذات باری اور صفات باری کے ساتھ چمٹا رہے گا سب رحمتیں اس پر ہوں گی۔ اور وہ ہر قسم کا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ تو بسم اللہ کا خلاصہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

اور یہ "الصاق" ہوا۔ جس پر بسم اللہ کی باء دلالت کرتی ہے۔ اس کی بہترین تمثیل کی حدیث ہے جس سے
معلوم ہوتا ہے کہ انسان ذات باری کے ساتھ ملحق ہو سکتا ہے جیسے فرمایا گیا تخلقوا باخلاق اللہ
یا ذالجلال کا ورد کثرت سے کیا کرو۔ تو معلوم ہوا کہ اس ذات سے الصاق ہو سکتا ہے مگر اس کے لئے ایک
واسطہ ضروری ہے وہ اسماء الٰہیہ اور صفات الٰہیہ ہیں ان کو جپتے رہنے سے معبود و عبد کے درمیان تعلق پیدا ہو
جاتا ہے جو کہ ثمرہ (فائدہ مراد اور نتیجہ) ہوتا ہے

نتیجہ یہ نکلا کہ سارے قرآن کا خلاصہ سورۃ فاتحہ ہے اور سورۃ فاتحہ کا خلاصہ بسم اللہ ہے اور بسم اللہ کا خلاصہ
"با الصاق" ایک لفظ کو دوسرے الفاظ سے جوڑنے والی کی ہے یہ "تفسیر عزیزی" کا خلاصہ ہے۔ اور کہا جاتا
ہے کہ باء کا خلاصہ یہ نقطہ ہے تو ہو سکتا ہے اس پر علامہ رشید رضا مصری نے اعتراض کیا کہ یہ تو لغو کلام
ہے مگر کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ یہ تفسیر تو نہیں مگر یہ توجیہ لطیف ہو سکتی ہے اور سارے قرآن کو نقطہ میں وجود اجمال
کے ساتھ مانا جائے اگرچہ اس میں تفصیل نہیں ہے جیسے "گٹھلی" خلاصہ ہے مگر اس سے سارا درخت اور شاخیں
وغیرہ نہیں نکالی جا سکتیں۔ ایسے ہی یہاں بھی ہے تو سورۃ فاتحہ کا ام القرآن ہونا ثابت ہو گیا۔ بسم اللہ
کی تفسیر میں ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید کا معجزہ ہونا اس پر بہت سی کتب لکھی گئی ہیں وجوہ اعجاز میں
بہت سا اختلاف ہے بعض فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اور بعض چار وجوہ کے لحاظ سے مانتے ہیں لیکن
بعض محققین چار وجوہ سے کہتے ہیں

۱۔ مفردات کے اعتبار سے کہ جو لفظ کسی جگہ پر رکھ دیا گیا ہے اگر اس کا مرادف اس کی جگہ رکھا جائے۔
تو اس مضمون کی حالت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ وہی پہلا لفظ ہی موزوں ہے جیسے "موت" اور "توفی"
کا لفظ ہے جس مقام میں توفی کا لفظ لایا گیا ہے۔ اس کو موت کا لفظ ادا نہیں کر سکتا

۲۔ ترتیب کے اعتبار سے اعجاز ہے کہ اگر ترتیب کو بدل دیا جائے تو آیت میں جو مفہوم بیان کرنا مطلوب ہے، وہ
ظاہر نہ ہو سکے گا مثلاً یہ آیت ہے

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ (پ ۸ ع ۲ سورۃ الانعام ع ۱۲)

ترجمہ۔ اور ان کفار و مشرکین نے ٹھہرا لیا ہے اللہ کے شریک جنات کو
کہ اگر اس میں الجن کو مقدم کیا جائے تو ترجمہ یہ قریب ہے مگر چونکہ اس سے مقصود شرک کی
تقسیم اور برائی ہے۔ اور وہ دو طرح سے ایک تو شریک ٹھہرانا دوسرے وہ بھی فرشتوں اور انسانوں سے کمتر

toobaa-elibrary.blogspot.com

کو تو یہ تسمیہ الفاظ کی تقدیم کی صورت میں نہیں ہو سکتی ایسے ہی فرمایا گیا ہے کہ۔

ولا تقتلوا اولادکم من [illegible]

[illegible]

ترجمہ اور نہ قتل کرو تم اپنی اولاد کو افلاس اور تنگدستی کی وجہ سے ہم رزق دیں گے تم کو اور ان کو بھی۔ اور دوسری جگہ فرمایا۔

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ [illegible]

ترجمہ نہ قتل کرو تم اپنی اولاد کو تنگدستی کے خوف سے ہم روزی دیں گے ان کو اور تم کو بھی۔

ایک جگہ مخاطب کو مقدم کیا گیا اور دوسری جگہ غائب کو مقدم کیا اگرچہ مطلب ایک ہے۔ مگر بڑی گہری نکتہ کی بات ہے اس جگہ دو مضمون ہیں جو کہ "من املاق" اور "خشیۃ املاق" سے معلوم ہوتے ہیں کہ ایک قسم کے تو ایسے لوگ تھے جن کے پاس کچھ نہیں تھا بہ دست مفلس تھے۔ اُن کو من املاق "یعنی افلاس موجودہ کی وجہ سے قتل کرتے ہیں۔ اس لئے اُن کا ذکر غائب پر مقدم کیا گیا۔ اور چونکہ "خشیۃ" متوقع آنے والی چیز پر ہوتی ہے اور دوسری پارٹی وہ تھی جس کے پاس کچھ موجود تھا مگر اُن کو مفلس ہونے کا اندیشہ تھا اس لئے وہاں "نحن" کو مقدم کیا اور "کم" کو موخر رکھا کیونکہ بنا فکر تا تو ی درجہ پر تھا۔ ایسے حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ "حتی" تو معز مہمان کی حیثیت سے جائیں گے اور ان کی تمام اشیاء ضروریات کو پہلے مہیا کیا جاتا ہے اور وہ بے کھٹکے چلا جاتا ہے مگر قید خانہ کا دروازہ کھلا نہیں رہتا۔ ملکہ بعد میں کھلتا ہے مجرم کو داخل کر کے پھر بند کر دیا جاتا ہے فرق محض واؤ کے ذکر اور عدم ذکر کا ہے مگر مضمون بدل جاتا ہے۔ حضرت الوست صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دو لاکھ کتب تعبیر کی لکھی جا چکی ہیں مگر کما حقہ اعجاز قرآن کو بیان نہیں کیا گیا مشرق و مغرب کی طرف لفظ رب کی وضاحت کی گئی ہے۔ اب ایک جگہ المشرق و المغرب فرمایا اور دوسری جگہ "رب المشرقین و المغربین" اور تیسری جگہ "رب المشارق و المغارب" ان سب سے مراد مادی تعدلے ہیں مگر ان میں یقیناً فرق ہیں۔ ایسے ہی ایک جگہ آتا ہے

[illegible]

(پ ۱۳ ع ۱۷ س ۱۴ ابراہیم ع ۵) [illegible]

toobaa-elibrary.blogspot.com

ترجمہ۔ کیا ان اقوام کو رسولوں نے کیا تمہیں اللہ کے وجود میں شک ہے جو بنانے والا ہے
آسمانوں اور زمین کو۔
آگے چل کر فرماتے ہیں۔
قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ
ترجمہ۔ کہا ان کو ان کے رسولوں نے نہیں ہیں ہم۔ مگر "آدمی" تم جیسے۔
اس جگہ لحم کا لفظ بڑھایا گیا ہے۔ حالانکہ وہی پہلے لوگ مخاطب ہیں۔

۳۔ عجائب کا مقصد جس میں حکماء وعقلاء اس گتھی کو سلجھانے سے عاجز رہے ہیں۔ اُن کی شرح ایسے سہل کی جاتی ہے۔ کہ اگر ایک عامی اس کو سنے۔ تو وہ بھی سمجھ لیتا ہے اور عقلمند عاقل سے عاقل اس میں غوطہ لگائے۔ تو وہ بھی عجائب قسم کے موتی لاتا ہے۔

۴۔ مقاصد قرآنیہ کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن نہ صرف سمجھ میں آجائے بلکہ قلب میں مسلط ہو جاتا ہے۔ جس سے قلوب زندہ ہو جاتے ہیں۔ جیسے فرمایا۔
وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ربع ۲۵ ع ۵ سورۃ الشوریٰ رکوع ۵
ترجمہ۔ اور اسی طرح ہم نے اُتارا آپ کی طرف ایک روح کو اپنے حکم سے
روح کا کام یہ ہے کہ اس چیز کو زندہ کر دیتی ہے۔ ایسے ہی قرآن بھی ایک روح ہے۔ جو کہ قلب پر قبضہ کر کے اس کو زندہ کر دیتا ہے

تفسیر بسم اللہ

احناف کے ہاں یہ آیت مستقلہ ہے۔ امام ہشام عبدالرحمن اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام احمد سے بھی ایک روایت ہے۔ اس میں آٹھ قول ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کو جزو مانتے ہیں۔ امام فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے سترہ دلائل بیان کئے ہیں۔ مگر اُن سب کا جواب روح المعانی والے نے دیا ہے۔ احناف کی دلیل یہ ہے
عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا كَانَ يَفْتَتِحُ الصَّلٰوةَ بِالتَّكْبِيْرِ وَ الْقِرَاءَةَ بِالْحَمْدُ لِلّٰهِ۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

ترجمہ۔ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر تحریمہ اور قرارت سورۃ فاتحہ سے نماز کا افتتاح کیا کرتے تھے

اگر بسم اللہ قرآن کا جزو ہوتا۔ تو آپ ہمیشہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے نماز کیوں شروع کرتے اور ایک حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ۔

لَا يَذْكُرُوْنَ فِيْ اَوَّلِهَا وَاٰخِرِهَا

ترجمہ۔ صحابہ کرام نماز کے شروع اور آخر میں کوئی اور ذکر نہیں کیا کرتے تھے۔

تیسری حدیث حضرت عبداللہ ابن مُغفل رضی اللہ عنہ کی ہے کہ۔

اِيَّاكَ يَا بُنَيَّ ، خبردار! اے بیٹے۔

چوتھی حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے کہ۔

قَسَمْتُ الصَّلٰوةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ فَاِذَا قَالَ الْعَبْدُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ قَالَ حَمِدَنِيْ عَبْدِيْ" وَاِذَا قَالَ "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" قَالَ اللّٰهُ اَثْنٰى عَلَيَّ عَبْدِيْ" وَاِذَا قَالَ "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" قَالَ اللّٰهُ حَمَّدَنِيْ ،

ترجمہ۔ میں نے نماز کو اپنے اور بندہ کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کر دیا ہے۔ سو جب بندہ کہتا ہے۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" تو اللہ تعالٰی فرماتے ہیں۔ میرے بندہ نے میری تعریف کی۔ اور جب بندہ کہتا ہے "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" تو اللہ تعالٰی فرماتے ہیں۔ میرے بندہ نے میرے متعلق بہت تعریف کی۔ اور جب بندہ "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" تو اللہ تعالٰی فرماتے ہیں۔ میرے بندہ نے میری تعریف کی ہے۔

یہ تین سوال خالص اللہ تعالٰی کے لئے ہیں۔

وَاِذَا قَالَ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" قَالَ اللّٰهُ هٰذَا بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ "

ترجمہ۔ اور جب بندہ کہتا ہے "اِیَّاكَ نَعْبُدُ" (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) تو اللہ تعالٰی کہتا ہے "یہ معاملہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے"

عبادت تو اسی کا حق ہے "استعانت" سے اپنا سوال شروع ہوتا ہے اور جب اِهْدِنَا کہتا ہے۔

تو فرماتے ہیں۔

[illegible]

ترجمہ: یہ میرے مدد گار سب ہے اور میں جو کچھ ہے وہ سب کچھ ہے جو میں نے مانگا ہے
یہ حدیث تو درست ہے کہ یہ ایک آیت کو بیان کیا جاتا ہے مگر بسم اللہ کا کہیں بھی ذکر نہیں۔
شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ تو حقائق کا نام ہے دوسرے حافظ ابن قیم جو کہ تمام علوم میں ماہر ہیں۔
تیسرے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ "اور صلوٰۃ کا یہ ہے کہ جس آیت پڑھو سب متعلقہ ہے۔ اس پر
تھوڑا سا توقف کرنا چاہیے۔"

تو ان آیات سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ جزو نہیں مگر اس پر حافظ ابن قیمؒ و شیخ جمال الدین
دوانی معانی والے سید آلوسی کہتے ہیں کہ کوئی حدیث صحیح اور صریح نہیں کہ جس سے بسم اللہ کا جزو
قرآن ہونا معلوم ہو مگر استقلال کی بہت احادیث ہیں۔ بسم اللہ کے فضائل بہت سے جمع کیے گئے ہیں
چنانچہ ابن کثیر نے ایک مستقل فصل اس کے لیے لکھی ہے۔ حاکم نے ایک حدیث جس کو ضعیف ٹھہرایا ہے
مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے
متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اسم ہے اور اس اسم کو اسم اکبر کے ساتھ ایسا
قرب ہے جیسے آنکھ کی سفیدی کو سیاہی کے ساتھ اس تشبیہ میں کوئی خاص مناسبت ہے۔ اس کی
اسناد قوی ہے یہ تو احادیث میں مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ کا "اسم اعظم" ہے۔ اس میں علماء کو بہت
اختلاف ہے فتح الباری میں ایک روایت ہے کہ اسم اکبر اللہ تعالیٰ کا "رب" ہے۔ باقی تمام
احادیث میں اسم اکبر کا لفظ مذکور نہیں بلکہ اسم اعظم کا لفظ ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اسم اکبر رب ہے چنانچہ
شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ جتنے اسماء الٰہیہ ہیں کہ جو تعداد کے حساب سے ہیں ان سب سے زیادہ تعلق
"رب" کو ہے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ قریب "رب" کے بسم اللہ ایسے ہے جیسے سواد عین (سیاہی) اور بیاض عین
آنکھ کے ڈھیلے کی سفیدی۔ اس میں ایسا تعلق ہے کہ بیاض سواد کو محیط ہے تو بسم اللہ اور رب کو جو
تشبیہ دی گئی ہے ان میں سے ایک اسم تو اللہ دوسرا رحمٰن اور تیسرا رحیم
"محمد رسول اللہ" میں لفظ اللہ اور ... رحمٰن کو الگ کر کے درمیان میں
"رب العالمین" کو رکھا گیا تو ایسے ہے کہ جیسے آنکھ کی سیاہی درمیان ہی میں ہے۔ ادھر بسم اللہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

... کے اعتبار سے معانی آتے ہیں۔ اس جگہ دو میں سے ایک کا ارادہ کیا گیا ہے۔ علامہ زمخشری اگرچہ معتزلی ہے مگر بڑا امام ہے وہ ب کو مصاحبت کی کہتے ہیں۔ مگر قاضی بیضاوی ب کو استعانت کی کہتے ہیں یا مصاحبت کا دوسرا احتمال بھی ہے مگر قریب الی الذوق یہ ہے کہ اس جگہ با مصاحبت کی ہے کیونکہ حدیث شریف میں ہے

بسم اللہ الذی لا یضر مع اسمہ شیء

ترجمہ۔ اس اللہ کے نام سے جس کے نام کے ساتھ کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

مع کا لفظ معیت پر دلالت کرتا ہے۔ معیت میں اس مصاحبت سے زیادہ مبالغہ ہے دوسرا ایک حدیث شریف مسند امام احمد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کو ٹھوکر لگی تو ردیف کی زبان سے نکلا۔ تعس الشیطان (ہلاکت ہو شیطان کے لئے) تو آپ نے فرمایا لا تقل کیونکہ شیطان اس سے پھولتا ہے۔ بلکہ کہو بسم اللہ" تو وہ چھوٹا ہو کر مکھی کی طرح ہو جاتا ہے کسی شاعر نے کہا

"شود عیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت"

تو اس جگہ بسم اللہ کہا گیا اس جگہ استعانت کے معنی ہو نہیں سکتے بلکہ مصاحبت کے معنی کی تائید ساتھ ہے۔ تطبیق کی صورت یہ ہے کہ مدلول تو مصاحبت ہے مگر مقصود استعانت ہے۔ یعنی اللہ کا نام میں کیوں لیتا ہوں تاکہ اس سے استعانت حاصل کرتا ہوں بعض روایات میں آتا ہے

افتتح بہ ... تو درود کھول اور بسم اللہ کہہ

غرض مقصد یہ ہے کہ مسلم کے دل میں ہمہ وقت یہ ہوتی ہے۔ اس کے متعلق میں کئی اقوال ہیں۔ مگر سب کا فیصلہ اس طرح کیا جائے گا۔ چونکہ صحیحین کی روایت ہے کہ آپ غار حرا میں تشریف لے جایا کرتے کہ ایک مرتبہ ملک آیا تو اس نے کہا اقرأ آپ نے فرمایا ما انا بقاری میں پڑھا ہوا نہیں سکتا کیونکہ آپ تحقیق رسالت میں تھے تو اس ملک نے دبوچا اور پھر کہا آخر تیسری بار اس ملک نے کہا

اقرأ باسم ربک الذی خلق   پارہ ۳۰ سورۃ علق

ترجمہ پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانے والا ہے پڑھ۔

اس دبوچنے پر بعض روشن خیال اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیا اور یہ دبوچنا کیا یہ سمجھ نہیں آتا۔ مگر جو چیز ہماری سمجھ میں نہ آئے اس کا نہ ہونا کیسے لازم آتا ہے۔ جیسا کہ حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

حیدرآباد میں ایک بڑے دواخانہ میں مجھے بجلی پہنچائی گئی تو میرے ایک رفیق نے میرے ہاتھ کو چھونا چاہا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری انگلی کٹ گئی۔ بعد میں اُسے معلوم ہوا کہ میری انگلی کٹ گئی مگر جب اس نے دور سے پکڑا! تو پھر کچھ محسوس نہ ہوا۔ ایسے ہی ایک دوسرے آدمی تھے ان میں بھی بجلی چلی گئی۔ جب بجلی کی یہ حالت ہے اور اُس کو وحی سے کوئی نسبت بھی نہیں تو اس کو آخر کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ اس لئے آپ نے فرمایا۔

إِذْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي — مجھے اپنی جان کا خطرہ لاحق ہوگیا۔

اس کی تقریر شیخ سندھی نے یہ کی ہے کہ۔ "جبرائیلؑ کے دبانے سے مجھے اتنی مشقت ہوئی کہ میں برداشت نہ کر سکا" تو معلوم ہو کہ اس دبانے کو کوئی نور کے ساتھ خاص تعلق ہے کہ جس سے آپ "قاری" بن گئے اور فرمایا کہ: "یہاں تک کہ مجھے خوف ہوا کہ میں مر جاؤں گا" جیسے ہم تک یہ علوم پہنچے ہیں وہ قوم کے واسطے سے ہیں۔ مگر اس کو تو کچھ معلوم بھی نہیں کہ مجھ سے کیا لکھا گیا ہے۔ اصل تو لکھنے والا ہے۔ ایسے ہی جبرائیلؑ واسطہ ہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ کا اقتباس کرنے کی وجہ سے اقرأ کلمہ حذف مانا جائے۔ رہا اسم و مسمّٰی کا عین ہونا، اس پہ بہت سے علماء و فضلاء نے بحث کی ہے۔ جس سے یہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ "بدیہی البطلان" ہے۔ کیونکہ اسم تو لفظ ہے اور اس کا مسمّٰی ایک ذات ہوتا ہے۔ جیسے "نار" کا لفظ اگر مسمّٰی یعنی ذات مَعَ لَهُ الْإِحْرَاق (اس چیز کا وجود جس میں جلانے کی قوت اور صفت ہے) کا عین ہو تو۔ چاہیے اس لفظ میں بھی "احراق" (جلانے کا عمل) ہو۔ تو اس کو عبث قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے امام رازیؒ نے کہا کہ۔ "مجھے یہ سمجھ نہیں آتا" مگر دوسری جانب والے بھی بڑے بڑے محقق ہیں۔ دراصل اس بحث کا منشاء بعض قرآن مجید کے وہ الفاظ ہیں۔ جیسے "تسبیح" و "ذکر" و "برکت" وغیرہ جن کی کبھی تو باری تعالیٰ کی طرف نسبت کی جاتی ہے۔ اور کبھی اسم رب کی طرف جیسے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ اور کبھی اسم اللہ کی طرف جیسے ذِكْرَ اسْمِ اللَّهِ۔ تو اگر ان میں کوئی فرق نہیں، تو پھر تاویل ہو سکے گی۔ ایسے ہی فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ میں بھی تسبیح کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف ہے اور وَسَبِّحُوهُ۔ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا۔ تو ایسی آیات کثرت سے ملتی ہیں۔ اسی طرح تبارک کا لفظ ہے۔ جیسے۔

تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ۔

رب ہو ۲۹ ع ۱، س ۶۷، الملک، ع ۱

toobaa-elibrary.blogspot.com

ترجمہ۔ بڑی برکت ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں ہے بادشاہی۔

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔ (پ ۱۸، ع ۱، س ۲۳، "المؤمنون" ع ۱)

ترجمہ۔ سو بڑی برکت ہے اللہ کی جو سب سے بہتر بنانے والا ہے

اور کہیں فرمایا گیا ہے۔

تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔ (پ ۲۷، ع ۱۳، س ۵۵، "الرحمٰن" ع ۳)

ترجمہ۔ بڑی برکت ہے تیرے رب کے نام کی جو بڑائی والا اور عظمت والا ہے۔

تو ایک ہی لفظ ہے مگر کبھی تو اس کو ذات کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اور کبھی اسم ذات کی طرف تو معلوم نہیں ہوتا کہ آیا اطلاقات میں فرق ہے یا نہیں۔ کسی نے کہا کہ فرق نہیں مگر محققین کہتے ہیں کہ فرق ہے۔ تو ذکر کے ایک معنی یاد کرنے کے ہیں جو کہ نسیان کی ضد ہے جیسے

وَاذْكُرْ رَبَّكَ إِذَا نَسِيْتَ۔ (پ ۱۵، ع ۱۶)

ترجمہ۔ اور تو یاد کر اپنے پروردگار کو جب تو بھولے۔

اور ذکر قلبی ہے کہ جس کو زبان سے ادا کرنا ضروری نہیں بلکہ نسیان اور غفلت نہ ہو جب یہ لفظ ذات پر وارد ہوتا ہے۔ تو اس سے ذکر لسانی ہوتا ہے۔ زبان ضروری نہیں اور جب اسم کی طرف منسوب ہو تو پھر اس سے ذکر لسانی مراد ہوتا ہے۔ کہ خود اس کے اسم کا بھی زبان سے تلفظ کرنا ضروری ہے اسی طرح۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى (پ ۳۰ ع ۱۳) تو تسبیح کر اپنے بلند رب کے نام کی

یا حدیث میں ہے۔

سُبْحَانَ رَبِّكَ ذَاكِرًا اسْمَهُ الْأَعْلَى۔

ترجمہ۔ اپنے رب کی تسبیح کر اس کے بلند نام کا ذکر کرتے ہوئے۔

چنانچہ جب مذکورہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا۔

اِجْعَلُوْهَا فِيْ سُجُوْدِكُمْ۔ اس کو اپنے سجدہ میں رکھو۔

اور سجدہ میں زبان کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، اور جب فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ اِجْعَلُوْهَا فِيْ رُكُوْعِكُمْ۔

اور اگر کوئی اس کے خلاف کرے۔ تو تارک سنت ہوگا۔ ایسے ہی تَبَارَكَ الَّذِيْ سے جب

toobaa-elibrary.blogspot.com

ذات کی طرف . مخالفت ہو تو مسمّٰی مراد ہوگا، در جیب اسم کی طرف اضافت ہو تو اسم کا بابرکت ہونا بتلایا جاتا ہے۔ اِس فرق کو حافظ ابن قیم نے بیان کیا ہے۔ تو شاید یہ اشتباہ اس جگہ سے ہوا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسم میں گفتگو نہیں بلکہ اسماء الٰہیہ میں گفتگو ہے۔ کہ آیا وہ عین مسمّٰی ہیں یا نہیں چنانچہ معتزلہ کے ہاں کلام نفسی نہیں۔ اس لئے وہ اُسے غیر قرار دیتے ہیں اور اشاعرہ "لَا عَینٌ وَّلَا غَیرٌ" قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ تحقیق قرآن مجید سے نہیں سمجھی جاتی۔ بہ خلاف اول کے

الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ان کا ماخذ اشتقاق ایک ہے۔ اور اُن میں بہت سے اسرار رکھے ہوتے ہیں۔ فرق اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ "رَحۡمٰن" تو مبالغہ کے لئے نہیں۔ مگر اس سے کم درجہ ہے۔ پھر بعض کیفیت کے اعتبار سے فرق کرتے ہیں کہ رحمٰن کے لئے رحمت عامہ ہے خواہ مطیع ہو یا عاصی یعنی رحمت کے متعلقات بہت ہوں اور رحیم کا تعلق خاص ہے۔ جیسے مسلم و مطیع کے لئے اور کوئی اسے بہ عقبہ رکمیت کے ضمن قرار دیتا ہے کہ رحمٰن کا کام یہ ہے کہ وہ بڑی بڑی چیزیں دیتا ہیں جیسے آخرت وغیرہ اور رحیم میں چھوٹی چھوٹی نعمتیں۔ مگر یہ اس کی بنا اس قاعدہ پر ہے کہ جس کی بنا زائد ہو۔ اس میں معنی بھی زیادہ پائے جائیں۔ مگر یہ قاعدہ اغلبیہ ہے۔ کلیہ نہیں مگر ابو محمد جوینی" جو کہ امام الحرمین کے والد ہیں۔ مفتی محمد عبدہ نے ان کے قول کو خوب پھیلایا ہے کہ "فعلان ﷺ کے وزن پر جتنی چیزیں ہیں اُن میں صفات دائمہ و ثابتہ نہیں ہوتیں۔ جیسے "عَطۡشَان" پیاسا، "غَضۡبَان" غصہ سے بھرا ہو، وغیرہ۔ یہ ان صفات میں سے ہیں جو عارض ہوتی ہیں اور آتی جاتی ہیں۔ اس کے خلاف "فَعِیۡل" کا وزن اُن صفات کے لئے مستعمل ہوتا ہے جو دائمہ اور مستقرہ ہوں۔ جیسے "حلیم" جس میں بُردباری زیادہ ہو اور عقیل جس میں عقل زیادہ ہو۔ ایسے ہی کریم کا لفظ ہے۔ تو رحمٰن فعلان کا وزن ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف جو نسبت رحمت کی ہوتی ہے تو ایک تو رحمت آپ کی صفت لازمہ ذاتیہ ہے۔ اس پر "رحیم" بوزن فعیل دلالت کرتا ہے چاہے دنیا میں کوئی مرحوم ہو یا نہ ہو۔ مگر رحمٰن بوزن فعلان بہ معنی رحمت کرنے والا۔ یہ ایک فعل ہے اور فعل میں استقرار نہیں ہوتا تو بسم اللہ کا ترجمہ ہوگا کہ۔ پڑھتا ہوں میں اللہ کا نام لے کر جو رحمت کرنے والا ہے اور رحمت والا ہے مگر حافظ ابن قیم نے اس کا عکس بیان کیا ہے کہ رحمٰن تو رحمت ثابتہ ذاتیہ پر دلالت

toobaa-elibrary.blogspot.com

کرتا ہے اور رحیم اس رحمت پر دلالت کرتا ہے جو کہ فعل در تعلق رکھتی ہے ۔ یہ کے پاس شوہد قرآن میں چور کو پیٹنا حق تعالٰے کی رحمت ۔ وہ بھی دو طرح ہے کہ حقیقۃً بھی رحمت اور حقیقۃً بھی رحمت ۔ اور کبھی صورۃً عذاب جیسا علیہم السلام کو تکلیف دی گئی حتیٰ کہ انہوں نے کہا "متی نصر اللہ" کہ مگر حقیقت یہ ہے کیونکہ وہ تو "مرحوم کامل" ہیں اس لئے کہ اس سے اُن کے درجات بلند ہوتے ہیں اور اقوام اُن کی قربانیوں کو دیکھ کر رشک کرتی ہیں ۔ تو ایک رحمت ہے عامہ ہے جس کو "وسعت رحمتی کل شیئ" کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ۔ وہ کبھی تو اُن کے حق میں رحمت ہوتی ہے ، اور کبھی غیر کے لئے الغرض اس کا معنا رحمت ہے اس پر رحمٰن دلالت کرتا ہے ۔ اور رحیم اُس رحمت کو کہا جاتا ہے جو ظاہراً رحمت ہے جیسے ان یردن الرحمٰن بضر لا تغن عنی شفاعتهم شیئًا ولا ینقذون (پ ۲۳ سورہ یٰسٓ ع ۲)

"اگر مجھ پر چاہے رحمٰن تکلیف تو مجھے کچھ کام نہیں آئے گی ان کی سفارش اور نہ وہ مجھ کو چھڑا سکیں گے" کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کریں تو اُن کی سفارش کچھ بھی کام نہیں آئے گی ۔ تو کیا رحمٰن ضرر بھی کر سکتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ رحمٰن میں ضرر کی گنجائش ہے کہ اگر اس کے سے رحمت نہیں ہے مگر دو مردوں کے لئے ہوگی ۔ ایسے ہی ان تمسك عذاب من الرحمٰن یہی وجہ معلوم ہے کہ عرش تمام اشیاء آسمانی کو محیط ہے اُس کے لئے رحمٰن کی صفت ثابت کی گئی کہ جیسے عرش محیط ہے ۔ ایسے ہی اس کی رحمت اُس عرش پر چھائی ہوئی ہے مگر رحیم کی طرف کسی ضرر و عذاب کی نسبت نہیں کی گئی "انه غفور رحیم" "رؤف رحیم" "غفور ودود" ۔ تو یہ فرق کیا جا سکتا ہے کہ رحمٰن سے "صفت رحمت عامہ" مراد ہے اور رحیم سے "صفت رحمت خاصہ" مراد ہے ۔ اس کو شیخ اکبر ابن عربی نے بیان کیا ہے کہ رحیم اس کو کہتے ہیں کہ جو خاص رحمت بن جائے بعض محققین نے اس طرح فرق کیا ہے کہ ۔ رحمت دو قسم ہے ایک رحمت تو وہ ہے جو کسی مرحوم میں بغیر اس کے کسب اور واسطہ کے کی جائے ۔ جیسے ماں کے پیٹ والے بچے جنین پر رحمت کی جاتی ہے کہ خون وغیرہ پلایا جاتا ہے اور وہ جب دنیا میں آتا ہے تو اس پر جو رحمت کی جاتی ہے وہ والدین کی طبعی شفقت ہے مگر اس میں تو احتمال ہے کہ بڑا ہو کر کوئی اچھا کام کرے لیکن جانور کا بچہ ۔ اس سے تو کسی قسم کے نفع کی امید نہیں ۔ اور دوسری قسم یہ ہے جس میں کسب اور عمل کو دخل ہو وہ رحمت اس عمل کا

toobaa-elibrary.blogspot.com

نہ وجہ ہو جیسے کوئی آپ کی خدمت کر رہا ہے۔ اس کے لیے کوئی اچھا کام کر دیا تو اس کو رحمت سابقہ ورلاحقہ کہا جائے گا۔ تو ان لوگوں نے فرق کیا ہے کہ جو خیر کسی کسب و عمل کے جیسے ہمارے لئے ہوا کو پیدا کر دیا گیا۔ یہ تو ہمارے کسی عمل کا ثمرہ نہیں ہے۔ یہ تو محسن کا کام ہے۔ وہ تو مہربانی ورحمت بنی نوع انسان پر فرمائیں۔ یہ رحیم کا کام ہے۔ لیکن چونکہ اہل لغت میں سے کسی نے اس کو بیان نہیں کیا اور نہ ہی قرآن میں اس کا کوئی شاہد ملتا ہے۔ اس لیے اس کو چنداں معتد بہ نہ کہا جائے گا۔ رحمت رقتِ قلب بھی دل کا نرم ہونا کسی ایسی چیز کو دیکھ کر جس کا اثر قلب پر پڑے تو اس کے دیکھنے والے کے قلب میں ایک قسم کی رقت پیدا ہو۔ پھر وہ بھی کئی طرح کی ہوتی ہے۔ تو وہ ایک تاثر و انفعال ہوا۔ جیسے کسی فاقہ زدہ کو دیکھا جائے تو یہ انعطاف قلب کا سبب ہو اور اسے کھلانے پر مجبور کرے۔ اُسے رحمت کہتے ہیں۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے کتے کو دیکھا کہ نرم مٹی چاٹ رہا ہے۔ تو وہ کنوئیں میں اتر کر اپنے موزہ میں پانی بھر لایا۔ آپ نے فرمایا کہ: اُس رحمت کی وجہ سے اس کے گناہوں کی مغفرت کر دی گئی ہے۔ مگر باری تعالے تو متاثر نہیں۔ بلکہ وہ تو موثر ہے۔ ورنہ اس کے لیے حمیت اور نہ قلب ہے بلکہ اس کے لئے مزاج ہی نہیں جو اثر کو قبول کرے۔ اس لیے بڑے بڑے محققین نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے جس رحمت کا ثبوت کیا جاتا ہے وہ تجوز ہے وہ اس طرح کہ ایک تو مبدأ ہوتا ہے اور دوسرے آثار ہوتے ہیں۔ مبدأ تو کیفیت قلبیہ ہے۔ اور ایصالِ خیر اس کیفیت کا اثر ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو جو رحیم کہا جاتا ہے تو گویا مجاز ہوا کہ وہ مبادی کے اعتبار سے نہیں کیا بلکہ آثار کے اعتبار سے رحمت کو کہا جاتا ہے۔ مگر محققین کہتے ہیں۔ بلکہ باری تعالے کے لئے رحمت حقیقی ہونی چاہیئے اور ہمارے لئے رحمت مجازی ہو۔ یہ ایسے کہ جیسے پانی کی حقیقت تو برودۃ ہے۔ مگر گرم چیز کے اثرات سے اُسے اب حار کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ حرارت اس کی ذات میں نہیں مگر جب جو آگ کو حار کہیں تو یہ حرارت اس کی ذات میں ہے۔ کسی بیرونی چیز کا اثر نہیں ہے۔ ایسے ہی آفتاب کا منور ہونا اور زمین کا روشن ہونا۔ ایسے ہی جو رحمت مخلوقات میں پائی جاتی ہے۔ تو وہ بیرونی تاثرات میں پائی جاتی ہے مگر حق تعالے تاثرات سے پاک ہے۔ اس میں یہ رحمتِ حقیقی پائی جاتی ہے۔ جیسے آفتاب بالذات روشن ہے۔ کسی کے اثر کا متاثر نہیں۔ تو رحمت جو تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے یہ یہ تو ہے اس ذاتِ باری تعالے کی رحمت کا۔

یہ مضمون حدیث میں سمجھانے کے لئے دیا گیا۔ اللہ تعالٰی نے اپنی رحمت کو سو اقسام پر تقسیم کیا۔ ان میں سے ایک حصہ مخلوقات کو دیا اور ننانوے اپنے لئے رکھے۔ پھر اسی ایک رحمت میں سے باپ کی بیٹے پر، پیر کی مرید پر، ماں کی بچے پر۔ تو یہ تمام اس ذات باری کی رحمت کا "پرتو" ہیں۔ تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ باری تعالٰی کے لئے تو رحمت مجازاً ہے اور ہمارے لئے حقیقتاً ہے۔ جیسے ہم بھی حی اور عالم ہیں اور باری تعالٰی بھی "سمیع و بصیر" "علیم اور حی" ہے۔ مگر اس کی حیوۃ ہم جیسی نہیں اس کا علم ہم جیسا نہیں۔ کیوں کہ ہمارا علم تو معقولات عشرہ کے تحت میں داخل ہے۔ مگر باری تعالٰی ان معقولات سے پاک ہے۔ ایسے ہی سمع ہے کہ جیسے ہماری صفت سمع ہوا کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ تو پھر لو بامنہ لازم آئے گا کہ باری تعالٰی کے لئے کوئی صفت حقیقتاً نہ ہو یہ تحقیق "روح المعانی" والے نے کی ہے۔ تو کہا جائے گا کہ رحمت وہاں حقیقتاً ہے۔ سمع حقیقتاً ہے۔ ہماری رحمت اور سمع اس سے مستعار ہے۔ مگر وہ کَمَا یَلِیْقُ بِشَانِہٖ یہ ایسے ہی ہے۔ جیسے امام رازیؒ نے فرمایا کہ۔

"لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ" اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے لیکن اس کی سمع و بصر ہم جیسی نہیں۔ غیر مسلم اقوام نے اسی آیت کو یعنی صفت رحمت کو لے کر اسلام پر اعتراضات کئے ہیں۔ ایسے ہی نام نہاد مسلمانوں میں بھی بظاہر رحمت اس کے لئے منافی ہے کہ۔ آپ نے ہمیں ذبیحہ کے کھانے کا حکم دیا کہ شکار ذبح کر کے جانور کھاتے ہیں۔ حتی کہ حج امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک "افضل عبادات" ہے۔ اس میں خون بہانا ہے بلکہ حدیث میں ہے۔ اَلْحَجُّ اَلْعَجُّ وَالثَّجُّ حج نام ہے چیخ و پکار کرنے اور خون بہانے کا۔ اہل کتاب تو ذبیحہ کا اعتراض نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے ہاں بھی ذبیحہ کا کھانا جائز ہے۔ مگر مشرکین اور آج کل کے ہندو تو اسی کو لے کر اعتراض کرتے ہیں کہ۔ مسلمان ایک بے گناہ جانور کو ذبح کرتے ہیں۔ چنانچہ دیانندؒ نے اسی رحمت کی صفت کو لے کر کہا کہ۔ ذبح کرنے کے وقت یہ رحمت کہاں چلی جاتی ہے دوسرا جہاد کا مسئلہ ہے کہ وہاں آدمیوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ و ماسِ کے لئے نصوص کثرت سے ہیں۔ ایسے ہی احادیث بھی۔ کوئی مذہب ایسا نہیں کہ جو اللہ کو ماننے والا ہو۔ رحمٰن و رحیم نہ مانے بلکہ یہ ہندو دیوتا کہتے ہیں۔ اور جانور وغیرہ ہر ایک کے لئے ایک اجل مقرر ہے۔ حتی کہ جانور بعض اوقات اپنی طبعی موت سے اس طرح ہلاک ہوتا ہے کہ دیکھنے والا اس سے متوحش رہ جاتا ہے تو تکوینی طور پر یہ وہی بات کر رہی ہے جو حیوۃ دینے والی

toobaa-elibrary.blogspot.com

تو کسی چیز کو بلاوجہ درد پہنچانا اگر رحمت کے منافی ہے تو یہ موت کی تو تخلیق ہی ہوئی وہ یہ ہے کہ قدرت نے بعض ایسے جانور پیدا کئے ہیں کہ جن کی طبیعت وہ ایسی بنائی ہے جو دوسرے جانوروں کو پھاڑ کر چبا کر ہی پیٹ پالتے ہیں۔ جیسے شیر، بھیڑیا کا مزاج ہے کہ گھاس نہیں کھا سکتا تو اللہ نے گوشت ہی کہ اس کا مزاج ایسا پیدا کرتا کہ وہ گھاس وغیرہ کھائے۔ ایسے ہی موت کی چیز ہے تو جیسے وصف ہوتے ہیں کہ جیسے رحمت ایک صفت ہے۔ ایسے ہی حکمت بھی ایک صفت ہے۔ جس کا مقتضی یہ ہے کہ قدرتاً کو موت دے۔ رحمت کا مقتضی یہ ہے کہ وہ حکمت کے خلاف نہ ہو بلکہ کبھی حکمت غالب آجاتی ہے جیسے دشمن کو مارنا اور بیٹے کو تادیباً مارنا۔ حق تعالیٰ نے دنیا میں جتنی تکالیف اور تکوینیات رکھے ہیں وہ حکمت سے خالی نہیں۔ جیسے اموات و امراض وغیرہ کی قسم تو جیسے کر سکتے ہو ایسے ہی ہم بھی دیکھ لیں کر دیں گے۔ ایسے ہی جہاد کی حقیقت یہ ہے کہ جیسے آدمی اعضاء یک دیگر اعضاء ہی یک مجسمہ ہے اور یہ افراد اس کے اعضاء ہیں۔ اگر ان میں سے ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو سارے جسم کو تکلیف پہنچتی ہے بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ اسے مرہم سے ٹھیک کیا جاتا ہے یا اسے متعلقہ آپریشن کیا جاتا ہے یا ڈاکٹر اس کا فیصلہ کر دے کہ اس عضو کو کاٹ دیا جائے۔ مگر یہ حکمت سے خالی نہیں، رحمت ہی کے منافی نہیں۔ بلکہ ماں باپ تو فیس بھی ڈاکٹر کو دیتے ہیں۔ تو ایسے ہی کافر بھی ایک فاسد عضو ہے۔ کہ اگر اندیشہ ہو کہ سوا اس کے کاٹنے کے جسم کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ تو اُسے کاٹ دینا چاہئے ایسے ہی جہاد سے مقصود پہلے اسلام ہے۔ اگر کافر اسلام کے راستے سے روکنے لگیں۔ دوسرے جسم کو فاسد کرنے لگیں۔ تو ان کو کاٹ دینا چاہئے۔ کیونکہ اگر چور اور ڈاکو کو معاف کر دیا جائے۔ تو پھر کوئی مال محفوظ نہیں رہ سکتا۔ دنیا میں جو کتاب لکھی جاتی ہے اُس کا کوئی عنوان اور معنون لکھا جاتا ہے۔ کہ اس کو "تقدیم" "و انتساب" کہتے ہیں وہ کبھی تو بادشاہ کے نام پر اور کبھی استاد اور پیر کے نام پر ہوتا ہے اور کبھی جو سیرت پر کوئی کتاب لکھتا ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر نامزد کرتا ہے اور بعض اپنی بیوی کے نام نامزد کرتے ہیں۔ یہ یورپ میں مروج ہے۔ اگر عرض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کو نامزد کریں تو ان کے لیے کیا چیز ہے یا تم بڑے حاکم و سلطنت کے نامزد کرنا چاہیں تو وہ ذات باری تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔ اس لئے اگر اللہ تعالیٰ بھی کتاب کو نامزد کرنا چاہیں تو یہ بھی نام کے کسی کے ساتھ کریں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے بسم اللہ کے ساتھ نامزد کیا ہے

toobaa-elibrary.blogspot.com

کیونکہ دوسری جگہ آیا ہے۔ "الرحمٰن۔ علّم القرآن" رحمٰن نے قرآن سکھایا، کیونکہ دنیا میں رحمت کا ظہور قرآن سے زیادہ کوئی نہیں۔ تو یہ تسمیہ ہوا جیسے سرنامہ کہہ جاتے۔ اور یہ بھی اللہ تعالے کا نام رکھا ہوا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اسے بھی جزو کتاب کہا جائے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ اس پر انسان کا مبدء اور منتہی ہے۔ تو گویا ساری زندگی کا مبدء حمد سے ہو اور آخر بھی اسی پر ہو گا کیونکہ فرمایا "وَ آخِرُ دَعْوٰھُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" دراصل جنت کی دعا کا خاتمہ یہ ہو گا کہ سب خوبی اللہ کے لئے ہے گویا ہمارے سب اعمالوں کا

"حمد" ایک ضروری حصہ ہے اس حمد سے امتِ محمدیہ کو ایک خاص مناسبت ہے کیونکہ امتِ محمدیہ کے بانی کا نام بھی اسی حمد سے ماخوذ ہے جیسے "احمد" بمعنی زیادہ حمد کرنے والا "محمد" اور آپ کی امت کا لقب بھی پہلی کتب میں "حمادون" آیا ہے اور آپ کے جھنڈے کا نام بھی "لواء الحمد" ہے۔ تو وہ حمد جو آپ نے کی ہے اور آپ کی کی گئی ہے تو گویا وہ ایک جھنڈے کی شکل میں ہو گی اور آپ کا مقام بھی "محمود" ہو گا کیونکہ "مقاماً محمودا" و عسیٰ ... تو معلوم ہوا کہ اس حمد کو اس امت سے کوئی خاص مناسبت ہے۔ اسی لئے پہلے ہی جملہ میں حق تعالے نے متنبہ کر دیا کہ مومن اللہ تعالے کی ثنا اور اس کے اسماء حسنیٰ بیان کرے۔ اگر حمد بمعنی "شکر" لیا جائے تو بھی یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ مومن ہر حالت میں شکر ہی کرتا ہے۔

الحمد کا الف لام : اصل الف لام میں "لام جنس" سمجھا ہے یعنی "جنس ماہیت" پر دلالت کرتا ہے محققین کی یہی رائے ہے۔ اگر کوئی دلیل ہو تو پھر دوسرے معنی مراد لئے جائیں گے۔ بعض اس جگہ لام استغراق کا کہتے ہیں اور بعض جنس مدح المعانی والے نے لکھا ہے کہ لام جو بہ کلام سے جنس سمجھی جاتی ہے مگر استغراق کو مستلزم ہے کیونکہ للہ کا لام اختصاص کے لئے ہے۔ تو معنی یوں ہو گئے کہ جنس اور ماہیت حمد اللہ تعالے کے لئے مختص ہے کہیں اور نہیں پائی جاتی اور یہی استغراق ہے تو یہ توجیہ صحیح ہو گی۔ اگر اس پر شبہ ہو کہ لاکھوں اور کروڑوں اشیا کی

toobaa-elibrary.blogspot.com

حمد کی جاتی ہے تو اختصاص نہ رہے گا۔ مگر کہا جائے گا کہ حمد میں ثنا بالجمیل (بھلائی اور خوبی پر تعریف) معتبر ہے اور حمد کرنے والا بہ قصد تعظیم اس کی حمد کر رہا ہو جیسے کہ محاسن اور نقائص پر حمد نہیں ہوتی۔ دنیا کے کسی ذرہ میں جو کوئی خوبی موجود ہے۔ وہ اس کی ذاتی نہیں بلکہ وہ پرتو ہے حامد کی خوبیوں کا جیسے آفتاب کی روشنی سے تمام اشیاء منور ہوتی ہیں۔ ان میں ذاتی روشنی نہیں بلکہ یہ روشنی اس آفتاب کا پرتو ہے۔ اور جو حمد اس پر ہوتی ہے۔ وہ آفتاب کی حمد ہے۔ تو جہاں ہم نے کسی کی تعریف کی ہوتی ہے چونکہ وہ خوبیاں اس کی نہیں۔ بلکہ ایک مخزن سے کی ہوتی ہیں تو اس مخزن کی تعریف ہو جائے گی۔ جیسے کہ لکھ حمد سے کے لیے کہیں بھی پیسے داخل کئے جائیں وہ کیپی اور گورنمنٹ تک پہنچتے ہیں کیا خوب کہا ہے

حمد را با تو نسبتے است درست   بر در ہر کہ رفت بر در تست

اللہ تعالیٰ کا وجود ثابت کرنے کے بہت سے طریق ہیں۔ حکماء نے تو امکان سے اثبات کیا ہے کہ عالم میں جتنی اشیاء ہیں وہ ممکن ہیں یعنی نہ ان کا وجود ضروری ہے اور نہ عدم تو ان میں سے ایک جانب کو ترجیح دینے والی کوئی ذات ہونی چاہیئے۔ اگر وہ ممکن ہے تو اس کے لئے بھی کوئی مرجح ہونا چاہیئے۔ علیٰ ہذا القیاس اگر ایسے برابر سلسلہ چلا جائے تو پھر تو کوئی چیز موجود نہ ہوگی۔ تو اس کے لئے ایک ایسی ہستی ہونی چاہیئے جو واجب ہو تو اس واجب پر سلسلہ کو ختم کرتا ہے۔ دوسری قوم آئی اس نے حدوث سے اثبات کیا کہ حدوث بمعنی وجود بعد عدم ہے کہ کوئی چیز یا ہستی پہلے وہ نہیں تھی اب موجود ہوگئی۔ اس کے لئے کوئی محدث (غیر موجود کو پیدا کرنے والا) ضروری ہے۔ قرآن نے ایسے دلائل نہیں بیان کئے حکماء کے ہاں تو واجب الوجود ایک یعنی علت العلل ہے کہ اس کے بعد اشیاء میں عقل اول پیدا ہوئی پھر اس سے تمام اشیاء پیدا ہوئیں۔ تو وہ ایسی ذات کے لئے ارادہ و اختیار وغیرہ نہیں مانتے بلکہ ایک مادہ کو بھی قدیم مانتے ہیں۔ مگر قرآن مجید نے ایک اور طرح سے اثبات کیا کہ اس ذات کے لئے ارادہ و اختیار بھی ہے کیونکہ دنیا کا نظام محکم جس میں کسی قسم کا خلل اور فتور نہیں ہے تو اس کے لئے ایک ایسی ذات کا ہونا ضروری ہے جو مدبر ہو۔ اور تمام صفات کو مستجمع ہو جیسے کوئی شخص موٹر کو چلا رہا ہے اور اندر بیٹھا ہوا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ بغیر کسی کے اثر کے چل رہی ہے۔ ایسے ہی کاغذ مکتوب کو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سیاہی خود بخود اس پر گر پڑی ہے۔ بلکہ کہے گا کہ اس پر کسی ایسے شخص نے لکھا ہے جو فن کتابت سے واقف ہے ایسے ہی ایک ہیکل کو دیکھ کر انسان اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس منتظم طور پر بغیر کسی اچھے معمار کے وجود میں نہیں آیا۔ چنانچہ واقعہ ہے

toobaa-elibrary.blogspot.com

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا کہ اُن کا ایک "ملحد" سے مناظرہ ہوا۔ فاضل محمد عبد اللطیف قاسمی کی طرف سے اس مناظرہ کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔ واقعہ یوں ہے

کہ دریائے دجلہ کے باہر ایک مقرر وقت پر ایک "ملحد" اور "دہریہ" سے سراج الامت امام اعظم امام التابعین سیدنا ابو حنیفہ نعمان ابن ثابت رحمۃ اللہ علیہ کا مناظرہ طے ہوا بہت سے لوگ جمع ہیں امام اعظم قریباً دو تین گھنٹے کی تاخیر سے پہنچے مخالف و مقابل ملحد نے آپ کو دیکھتے ہی کہنا شروع کر دیا کہ۔ دیکھو جی۔ اتنا بڑا امام ہو کر وقت پہ نہیں پہنچا۔ یعنی خلاف وعدہ کیا اور اپنے علم کی کمزوری چھپائی حضرت امام اعظم نے جواباً فرمایا۔ معافی چاہتے میرا عذر تو سنو کہ مجھے تاخیر کیوں پیش آئی قصہ یہ ہے کہ جب میں دریا کے کنارہ پہ پہنچا تو وہاں پہ نہ تو کوئی ملاح تھا نہ کوئی کشتی تھی۔ بہت پریشان ہوا اتنے میں ایک تناور درخت دور سے دریا میں بہتا ہوا آرہا تھا۔ کبھی اس کا تنا اوپر کو ہو جاتا تھا اور شاخیں نیچے ہو جاتی تھیں۔ اور کبھی تنا نیچے ہوتا تو شاخیں اوپر ہو جاتیں آخر وہ درخت میرے سامنے آکر چر گیا اور اس کے تختے ہو گئے۔ پھر تختوں سے کشتی تیار ہوئی۔ اور وہ خود میرے سامنے آکے کھڑی ہوئی مجھے اٹھایا اور پار پہنچایا اس لئے مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

ملحد نے کہا کہ دیکھو اس بڈھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بھلا درخت خود بخود چر کر اس کے تختے کیسے بن سکتے ہیں۔ اور تختے خود بخود کشتی کی شکل میں کیسے بن سکتی ہے۔ اور پھر کشتی بغیر ملاح کے خود بخود چل کر کیسے پار کر سکتی ہے۔ اس پہ حضرت امام اعظم نے فرمایا "بس مناظرہ ختم ہے" ملحد نے کہا وہ کیسے۔ ابھی تو اصل مسئلہ پہ گفتگو بھی شروع نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی جانبین نے اپنے دلائل دیئے ہیں۔ تو مناظرہ ختم کیسے ہو گیا ہے۔ حضرت امام اعظم نے فرمایا مناظرہ ختم ہونے پہ میری دلیل ہے کہ اگر ایک درخت سے خود بخود کشتی نہیں بن سکتی اور کشتی بغیر ملاح کے سوار نہیں اٹھا سکتی اور ساحل پہ نہیں پہنچا سکتی تو پھر عالم کا یہ سارا نظام خود بخود کیسے چل سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کا بنانے اور چلانے والا کوئی قدرت کا مالک اور بڑے تدبر والا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ جس پہ لوگ ششدر رہ گئے۔ اور وہ ملحد اور دہریہ لاجواب اور ذلیل و خاموش ہو کر واپس چلا گیا اور حضرت امام اعظم کے فرمان کے مطابق واقعہ مناظرہ ختم ہو گیا۔

جیسا کہ قرآن شریف سے استدلال ہے کہ جہاں فرمایا۔

[illegible] وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا

toobaa-elibrary.blogspot.com

وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ کُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ پ ۲ ع ۴ سورۃ البقرۃ ۱۶۴

ترجمہ: یقیناً رات اور دن کے بدلتے رہنے میں، ان کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کے کام کی چیزیں لے کر چلتی ہیں، اور پانی میں جس کو اللہ اتارتا ہے آسمان سے پھر زندہ کیا اس سے زمین کو اس کی مردنی کے بعد اور پھیلائے اس میں سب قسم کے جانور۔ اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادلوں میں جو کہ تابع دار ہو اس کے حکم کا۔ آسمان اور زمین کے درمیان بے شک یہ سب چیزیں نشانیاں ہیں عقل مندوں کے لئے۔

۲۔ اگر ایک چھوٹے سے عضو پر بھی غور کرے۔ تو اس کو واضح ہو جاتا ہے کہ ایک مادہ جس میں کوئی شعور نہیں محض وہ شخص ایسا انتظام کیسے کر سکتا ہے۔ تو نظم عالم سے استدلال کیا گیا۔ یہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال ہے۔ یورپ کا ایک بڑا حکیم کہتا ہے کہ میری حس قدرت کے مکتب میں ایسی ہے کہ جیسے کسی کتاب پر ایک بچہ پڑا ہوا ہے اور اس کی انگلی ہی پڑی تاک جاتی ہے ہماری مثال بھی قدرت اللہ اور مراد اللہ میں ایسے ہی ہے۔ چوتھا استدلال یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز محدود ہے خواہ صفات ہوں یا وجود ہو یعنی اس وجود اور صفات کی حد بندی کر دی گئی ہے۔ جیسے سورج اور چاند کی روشنی کہ وہ ایک خاص وقت اور دائرہ میں روشنی پھیلاتا ہے۔ ایسے ہی کان کا سننا اور آنکھ کا دیکھنا یہ بھی محدود ہے۔

الغرض جب دنیا کی ہر چیز محدود ہے تو اب دیکھنا چاہئے کہ یہ تحدید کس نے پیدا کی کیونکہ اپنے لئے کوئی تو کوئی پسند نہیں کرتا۔ تو ماننا پڑے گا کہ کوئی اور ذات غیر محدود ہے اور وہ بھی ایسی جس کی صفات اور تمام چیزیں محدود نہ ہوں۔ تو خلاصہ یہ ہوا کہ تحدید یا تو اپنے نفس سے ہو گی یا کسی اور کی وجہ سے۔ انسان خود تو یہ نہیں چاہتا کہ میں عاجز ہوں اور دنیا کی اشیاء مثلاً دہلی کو دیکھ سکوں مگر نہیں دیکھ سکتا۔ ایسے ہی کان ہیں اگر ان سے نہ سنا جائے۔ بلکہ یہ بیٹھے کا کلام آنکھ سے لیا جائے۔ تو وہ ایک حرف بھی نہ سن سکے گی۔ اس کو قرآن مجید نے فرمایا۔ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ اور اس نے ہر چیز پیدا کی۔ اور کہیں فرمایا: اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ یقیناً ہم نے ہر چیز بنائی پہلے اندازہ ٹھہرا کر اس بیان کو "رعایت تحدید" کہتے ہیں۔ جس نے تحدید کر دی ہے اس کو لامحدود ماننا پڑے گا ورنہ اس کے لئے بھی کوئی محدد ماننا پڑے گا جو چیز محدود ہے۔ وہ لامحدود میں الادراک نہیں کہلا سکتی۔ شاعر نے کہا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

ع۔ ذہن میں جو گھر گیا لا انتہا کیوں کر ہوا   جو سمجھ میں آ گیا تو وہ خدا کیوں کر ہوا۔

اسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لَا اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْكَ اَنْتَ كَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ۔

ترجمہ اے اللہ میں آپ کی تعریف و ثنا کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ آپ ویسے ہیں جیسا کہ آپ نے خود اپنی تعریف کی ہے۔

کیونکہ مخلوق کتنی ہی بڑی ہو، اُس کی صفات و قوتیں محدود ہیں۔ وہ ایسی ذات کا ادراک کیسے کر سکتی ہے کہ جس کی تمام صفات و کمالات غیر محدود ہیں، تو ماننے پر تو مجبور ہیں۔ مگر سمجھنے سے قاصر ہیں۔ الحمد للہ کی تفسیر میں ایک حدیث ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔

ترجمہ اللہ ہر نقص سے پاک ہے اور ہر قسم کی تعریف اللہ ہی کے لئے زیبا ہے۔ اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔

ان تینوں کو تو سمجھ لیا۔ مگر "الحمد للہ" کو نہیں سمجھا۔ تو حضرت علیؓ متعجب رہے کہ ایسے "محدّث اور مدبّر" یہ کیسے کہہ رہے ہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ کَلِمَۃٌ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ یعنی وہ ایسا کلمہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے پسند کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کی دو قسمیں ہیں۔

ان "ثبوتیہ" اور "سلبیہ" سلبیہ جیسے جسم اور جوہر، اور عرض، مکان، روحانی وغیرہ ان سب سے منزہ ہے۔ لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ۔ اسے تنزیہ کہتے ہیں اور ثبوتیہ یہ ہیں کہ حی ہے۔ قیوم ہے۔ سمیع ہے۔ تو چونکہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حی ہے تو اس کی حیات کیسی ہے؟ مگر کہا جاتا ہے کہ حیات نہ ہے مگر وہ بیشک یہ ہوتے ہیں مگر اس کی کیفیت کو ہم نہیں جانتے۔ جیسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

اَلْكَیْفُ مَجْهُوْلٌ وَالسُّؤَالُ بِدْعَةٌ

ترجمہ۔ اللہ کی حیات اور صفات کی کیفیت کی خبر نہیں اور ان کی وضاحت کے لئے سوال بدعت ہے؟ کوئی وصف اس کی ہم اپنی عقول میں نہیں ادراک کر سکتے۔

اور صفاتِ سلبیہ کو جانتے ہیں کہ اس سے فلاں چیز کی نفی ہو رہی ہے۔ مگر صفتِ ثبوتیہ کا ادراک نہیں ہو سکا اس لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ سبحان اللہ وغیرہ کو تو جانتے ہیں۔ مگر الحمد للہ کہ جس میں

toobaa-elibrary.blogspot.com

تمام صفات تو تیرہ ہیں کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس لئے حضرت علیؓ نے فرمایا کہ۔ میں کسے آپ کی مدحت پڑھوں۔ کیونکہ یہ آپ کی اجمالی تعریف ہے۔ مگر انسان اس کی کسی تعریف کو، وصفت کما حقہٗ اور ان کے حقائق کو نہیں جان سکتا۔ البتہ لفظی ہر تعریف کی کر سکتے ہیں۔

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

رب مصدر ہے بمعنی اسم فاعل کے ہے۔ بمعنی تربیت کرنے والا کسی چیز کو حدِ کمال تک پہنچانا۔ تدریجاً تدریجاً۔ یہ لفظ نمو کا تینوں عالم میں پایا جاتا ہے۔ نباتات، حیوانات اور انسان۔ ان تینوں عالم میں نشوونما پایا جاتا ہے۔ اس لئے رب کا اطلاق ان پر ہوگا۔ رب سے رباب آتا ہے۔ بمعنی بادل کیونکہ اس کے ذریعہ سے ہی زمین کا نشوونما ہوتا ہے۔ ربیبہ اور ربیب وہ لڑکی اور لڑکا جو کسی کی گود میں پرورش پاتے ہوں۔ ربّ جو کسی لڑکے وغیرہ کی تربیت کرے والا ہو۔ ربانی جو کہ علوم صفات کو آہستہ آہستہ پڑھاتے۔ ربّی بمعنی رب والا جس کی تربیت اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہو تو ترجمہ ہوا کہ وہ رب ہے تمام عالمین کا۔ اس لئے کہ یہ ایک حیثیت سے تو ہمارا مربی باپ بھی ہے، مرشد بھی ہے۔ مگر اس کی تربیت محدود ہے۔ حتیٰ کہ چاند ہو، پانی۔ ان کی تربیت بھی محدود ہے۔ مگر رب وہ ذات ہے کہ جس کی تربیت تمام جہات میں اور ہر وقت میں ہو۔ جیسا کہ جب فرعون نے سوال کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ هُوَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ پھر اس فرعون نے تمسخر کیا اور اپنے حلقہ نگوشان سے کہا کہ۔ موسیٰ رب العالمین کی شیون تو بتلاتا ہے۔ اور اس کی ذات نہیں بتلاتا۔ تو آپ نے فرمایا۔

رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِیْنَ۔

ترجمہ۔ وہ خدا تمہارا اور تمہارے پہلے آباؤ اجداد کا پالنہار ہے۔ تو اس نے کہا۔ یہ دیوانہ ہے تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ۔

ترجمہ وہ مشرق اور مغرب کا پالنہار ہے اگر تم عقل رکھتے۔

تو معلوم ہوا کہ تمام "الحمد" تمام جہات میں اس کی تربیت ہے۔ فرعون تو اس کو جانتا تھا۔ مگر عناد کی وجہ سے یہ کہتا تھا تو اس سے معلوم ہوا کہ اگر اس کی حقیقت بیان کی جا سکتی۔ تو موسیٰ علیہ السلام بیان

toobaa-elibrary.blogspot.com

کر دیتے۔ مگر انہوں نے بھی ستیوں (احوال وصفات بیان کئے ہیں، جتنی چیزیں دنیا میں ہیں۔ ماسوا اللہ اُن میں سے اگر کسی کی تعریف کی جائے۔ تو ان میں سے کوئی ایسی چیز ممکن نہیں کہ جس کی ذات "مستحق التعریف" ہو۔ کیونکہ نہ اُن کا "وجود" اپنا ہے۔ نہ ان کے صفات اور نہ اُن کے کمالات۔ بلکہ وہ دوسری ذات سے مستفاد ہیں کیونکہ مثلاً بچہ کو دیکھا جائے تو وہ ایک نطفہ (قطرہ) تھا نطفہ سے مضغہ (لوتھڑا) بنا پھر اس کی ذات ہے۔ بلکہ اُس کا وجود بھی اپنا نہیں۔ جیسے دروديوار اور زمین وغیرہ آفتاب سے منور ہوتے ہیں۔ یہی ذات کے عقیدہ سے معترض ہیں تو اس کی ذات پر توحمد نہیں ہوسکتی کیونکہ حمد "ثناء بالجمیل" (صفات وکمالات حسنہ پر تعریف) کا نام ہے۔ اور یہ ذات اس کی اپنی نہیں۔ بلکہ اُس کی صفات پر تنا ہوگی۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی نفس ذات خود "منبع صفات" ہے کسی دوسری چیز کا اُن میں دخل نہیں۔ جیسے آفتاب اپنی شعاعوں سے روشن نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ شعاعیں اُس کے نور کا پرتو ہیں۔ جو کہ اُس کرہ میں پایا جاتا ہے شعاع اس نور کی ایک منزل کا نام ہے وہ شعاعیں باہر سے نہیں آتیں۔ ایسے ہی حق تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے کامل ہے تو حمد کا استحقاق باری تعالیٰ کے لئے اپنی ذات کے اعتبار سے بھی ہو اور صفات کے اعتبار سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہا جاتا۔ تو بھی مقصد ادا ہو سکتا تھا۔ مگر چونکہ لفظ اللہ ذات پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے پہلے اسم ذات کو ذکر کیا گیا۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ذاتاً و صفۃً دونوں محمود ہے بخلاف دیگر اشیاء کے کہ اُن کی ذوات "محمود" نہیں ہیں۔ ورنہ "ربوبیت" ممکنات بھی ایک دوسرے کی کرتے ہیں مگر یہ تربیت کا محدود دائرہ ہے سب سے بڑا کرہ "آفتاب" کا ہے اس کی تربیت اللہ ایک محدود دائرہ میں ہے یعنی عالم حرارت کی تربیت کرسکتا ہے۔ مگر عالم برودۃ کی تربیت نہیں کرسکتا۔ ایسے ہی اگر ہم یہ چاہیں کہ چوکا جسم "ہو" سے بنتے ہیں وہ "زمین اور یبوست سے لینے لگیں۔ یہ تو ہرگز نہیں ہوسکتا۔ ایسے ہی باپ کا اپنے بیٹے کی تربیت کرتا ہے۔

بعوض اس کے نے تعریف وحمد مالکیت نہیں ہوسکتی۔ توحمد کا مستحق وہ ہے۔ جس کی تربیت کامل ہو کوئی زمان کوئی "مکان" کوئی "جہت" اُس کی تربیت سے خالی نہ ہو۔

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ | عالم کا لغوی معنی ہے: "مَا یُعْلَمُ بِهِ الشَّیْءُ" (جس سے کسی چیز کو جانا جائے) جیسے "خَاتَم" بمعنی "مَا یُخْتَمُ بِهِ الشَّیْءُ"۔ (جس سے کسی چیز کو ختم کیا جائے) یہ علامت سے لیا گیا ہے یا "علم" سے ماخوذ ہے اس معنی سے کائنات

toobaa-elibrary.blogspot.com

کو "عالم" اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کو دیکھ کر اس کے "مربی" اور "صانع" کی معرفت ہوتی ہے جو ایک اعرابی نے کہا تھا۔

اَلْبَعْرَةُ تَدُلُّ عَلَى الْبَعِيْرِ وَآثَارُ الْاَقْدَامِ تَدُلُّ عَلَى الْمَسِيْرِ فَسَمَاءٌ ذَاتُ الْاَبْرَاجِ وَاَرْضٌ ذَاتُ الْفِجَاجِ كَيْفَ لَا تَدُلَّانِ عَلَى اللَّطِيْفِ الْخَبِيْرِ

ترجمہ: مینگنی اونٹ کے گزرنے پر دلالت کرتی ہے۔ اور پاؤں کے نشانات چلنے والوں کے آنے پر دلالت کرتے ہیں۔ تو کیا یہ برجوں اور ستاروں والا آسمان، اور گزرگاہوں اور راستوں والی زمین لطیف و خبیر خدا کی ذات کی طرف کیسے راہنمائی نہیں کریں گے۔

تو عالم کو عالم اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ علامت ہے کہ اس کا کوئی بنانے والا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے ہر ہر ذرہ کو عالم کہا جا سکتا ہے۔ عرفی معنی یہ ہیں کہ ہر ذرہ کو عالم نہیں کہتے بلکہ وہ چند افراد کا مجموعہ ہے کہ جو صفات کے اعتبار سے متمایز اور جدا ہوں اور متجانس ہم جنس ہوں۔ کہ وہ ایک نوع یا جنس کے اندر داخل ہوں تو عالمین کے یہ معنی ہوں گے کہ جتنا جنس جس پر یہ عالم کا لفظ صادق آتا ہے۔ اس نوع و جنس اور جمیع افراد کو شامل ہو گا۔ اگر عالمین کی جگہ مخلوقات یا کوئی اور لفظ لایا جائے۔ تو یہ معنی حاصل نہ ہوں گے۔ کیونکہ وہ ایک ایسا لفظ ہے۔ جس کے ضمن میں ہی دلیل پائی جاتی ہے کہ مخلوق ہے تو لفظ تو دلالت کرتا ہے۔ مگر معنی پیش نظر رکھے جائے تو یہ خالق پر دلالت نہیں کرتا۔ ایک شاعر عیسائی نے اس کی بجائے اَلْحَمْدُ لِلرَّحْمٰنِ رَبِّ الْاَكْوَانِ بِمَسْبَحِ الْمُثَوِّبِ لکھا ہے۔ مگر جو رب العالمین دلالت کرتا ہے۔ اس پر "رب" کو "اکوان" دلالت نہیں کرتا اور الرحمٰن فقط محمد صلعم دلالت کرتا ہے۔ مگر حمید ذاتی پر دلالت نہیں کرتا۔ اس نے اس آیت میں تین تصرف کئے ہیں کہ لفظ "اللہ" کی جگہ "الرحمٰن" رکھا اور "الرحیم" کو حذف کر دیا اور "رب العالمین" کی بجائے "رب الاکوان" رکھا۔ مگر اس سے وہ مراد بھی نہیں ہو سکتی جو محمد شہ سے ہوتی ہے۔ پس یہ اس کی توہمات معنی ہیں کہ قرآن کا معارضہ نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی کسی کی تعریف کرے تو اس کے لئے کوئی سبب اور ٹیک ہونا ضرور ہے جیسا کبھی تو احسان کے بدلے میں حمد کی جاتی ہے اگرچہ وہ احسان شفقت نہ ہو یا مربی کا تربیت کرنا جیسے مدرس کو کسی شاگرد پر غصہ ہو تو وہ اس کو مدرسہ سے نکال نہیں سکتا بلکہ تربیت کرتا رہے گا جب تک اسے مدرسہ سے نہ نکال دے۔ کیونکہ وہ تنخواہ لیتا ہے۔ تو معلوم ہوا ہے کہ تربیت و احسان کبھی شفقت ہو

toobaa-elibrary.blogspot.com

وہ کبھی شفقت کی بنا پر نہیں ہوتا جیسے ماں باپ بچے کی تربیت کرتے ہیں اگرچہ اُن کا اپنا فائدہ مدِ نظر ہے، مگر اُن کا احسان ضرور ہے۔ لیکن رحمت خالصہ دنیا میں کہیں نہیں کیونکہ مخلوق کی شان میں اسی رحمت میں اُن کا اپنا کوئی نہ کوئی فائدہ مخفی ہوتا ہے خواہ وہ دنیاوی ہو یا اخروی روحانی یا جسمانی۔ مگر ایک اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ جو کسی فائدہ کی بنا پر نہیں نہ کوئی غرض ہے اور نہ کوئی عوض ہے۔ جیسے رومی نے کہا ہے کہ۔

ط من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

میں نے مخلوق کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ مجھے کوئی فائدہ پہنچائے گی بلکہ اس لئے پیدا کیا ہے کہ بندوں پر سخاوت اور احسان کروں۔

اوّل تو حمد تربیت کی بنا پر پھر شفقت پر، پھر شفقت کا مدح کرنی پڑے گی۔ مگر وہ شخص جو شفقت تو کرتا ہے مگر اس کے قبضہ اور قدرت میں نہیں۔ تو وہ کسی قسم کی شفقت نہیں کر سکتا۔ اور جس کی تربیت کامل اور اس کا منشا رحمت ہے اور رحمت بھی کاملہ ہے۔ تو اس کی حمد بھی اُن کے مقدار سے کامل و اکمل ہوگی کیونکہ وہ روزِ مالک ہے۔ "مالک" مِلک سے ماخوذ ہے اور "ملک" مُلک سے ماخوذ ہے۔ مالک تو ہر چیز کے تصرف کا مستحق ہوتا ہے۔ اور ملک سلطنت کا مالک ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا مالک اور ملک ہونا قرآن سے ثابت ہے۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ آج بادشاہی کس کی ہے، خود ہی جواب دیا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔
بادشاہی اس اللہ کے لئے ہے جو ایک اور زبردست ہے، یعنی ظاہری اور مجازی کوئی بادشاہ نہیں رہا۔

دوسری جگہ فرمایا۔
يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا۔ پ ۳۰ ع ۸ س ۸۲ الانفطار ع۔
ترجمہ۔ جس دن کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے لئے کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا،
یہ مِلک سے ماخوذ ہے یعنی کوئی شخص کسی دنیٰ چیز کا بھی مالک نہیں ہوگا بلکہ،
وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ اور اس دن صرف اللہ کے لئے ہو،

toobaa-elibrary.blogspot.com

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

دین کے معنی کئی آتے ہیں۔ جو کہ چھ سات کے قریب ہیں۔ ان میں سے ایک "جزا" ہے۔ یہ جزا و سزا دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ اس کا معنی ہے "بدلہ دینا" مطلقاً جیسے قرآن مجید میں آتا ہے۔ جَزَآءً وِّفَاقًا۔ یہ تو جہنمیوں کے متعلق ہے اور جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ بدلہ ہوگا تیرے رب کی طرف سے یہ متقین کے بارے ہے۔ مگر جو بڑے بڑے محقق ہیں وہ کہتے ہیں کہ "دین" اور "جزا" متقارب تو ہیں مگر مترادف نہیں کیونکہ جزا کا معنی ہے ہر چیز کا بدلہ خواہ اس جرم کی مقدار کے برابر ہو یا اس سے زیادہ ہو۔ یعنی شرط یہ نہیں کہ اس جرم کے موافق ہو۔ مگر دین اس جزا کو کہتے ہیں کہ جو حکمت کے موافق یعنی عمل کے مقتضی کے مطابق ہو لیکن تفصیل ہمیں معلوم نہیں۔ وہ سب دیکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ جہنمیوں کی سزائیں فرمایا "جزاءً وفاقاً" نہیں فرمایا کیونکہ بیکار تمام عبادت عمل کا ہے۔ ایک گلاس پانی کا ہو سکتا ہے اور اس پر جو ملا ہو سکتا ہے واقعہ بعض یہ کہتے ہیں کہ ایک عابد کی ہزار سال عمر ہوئی اور اس نے تمام عمر عبادت الٰہی میں گزاری۔ جب اس کا انتقال ہو تو کسی نے دیکھا کہ اس کی بخشش ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تجھے اپنے فضل پر جنت میں داخل کیا تو اس کے دماغ میں آیا کہ فضل تو زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرشتہ کو حکم دیتے ہیں۔ کہ اسے جہنم دکھلاؤ تو وہ پانچ سو برس کا فاصلہ تھا۔ جہنم کی ہوا کا جھونکا آیا تو اسے پیاس لگی۔ تو اس نے پانی طلب کیا۔ ایک فرشتہ پانی کا ایک گلاس لے کر وہاں سے گزرا تو اس نے کہا کہ مجھے پانی دے دو اس نے کہا اس کے عوض میں کیا دو گے؟ اس نے ساری عبادت دے دی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تو ایک ہزار سال کی عبادت کا صلہ ایک گلاس ہے اور دنیا میں تم نے کتنے چشموں اور نہروں سے پانی پیا اس کا عوض کب ہوگا۔ اس جگہ "یوم الدین" فرمایا گیا ہے "یوم الجزاء" نہیں فرمایا گیا کیونکہ "دین" وہ بدلہ ہے جو جرم کے مطابق ہو اور حکمت کا یہی تقاضا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ترجمہ ہے "روز جزا کے دن کا مالک ہے" "یوم الدین" کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ دنیا میں مجازات کا سلسلہ جاری ہے۔ جیسے چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کو حکومت سزا دیتی اور اللہ تعالیٰ بھی چھوٹے عذاب کا مزہ چکھاتے ہیں جیسا کہ فرعون، ہامان، شداد وغیرہ ان سب کو سزا دی ہے یہاں تک کہ احادیث میں آیا ہے کہ اگر مومن کو غم و حزن لاحق ہو تو وہ مومن کے گناہ کا کفارہ ہوگا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

تو مراد ہو گیا یوم الدین ایسے ہی جیسے آج کل یوم آزادی وغیرہ منایا جاتا ہے۔ کہ اس دن ہم کارروائیاں کی جاتی ہیں جو اس دن سے پہلے متفرق طور پر موجود تھیں۔ لیکن ان کو ایک خاص دن میں پورے اہتمام کے ساتھ بیک وقت پورے ملک میں منایا جاتا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے اور بعد میں بھی اس کے متعلق کارروائیاں ہوا کرتی ہیں چنانچہ اس کو "یوم" اور "دن" کہا جاتا ہے

اسی طرح بے شک اس دنیا میں بھی مجازات کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر یہ متفرق اور جزئیہ کے طور پر ہے۔ بسا اوقات معذب کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہ سزا کس چیز کا بدلہ ہے۔ تو اس عالم میں سزا و جزا ملتبس ہیں۔ کبھی کبھی سمجھ بھی لیا جاتا ہے۔ جیسے بدمعاشوں پر آفتیں یہ سزا اور عقوبت ہیں۔ لیکن انبیاء علیہم السلام پر ان کے مراتب کی بلندی اور علو کے لئے آفتیں آتی ہیں۔

غرضیکہ ایک تو یہ ہے کہ اس عالم میں جو امتحان کی جگہ ہے۔ سزا اور جزا ملتبس ہیں۔ دوسرے تمام عالم کی بیک وقت بھی مجازات نہیں۔ اس میں تو انسان کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ آفت میرے کس عمل کا بدلہ ہے۔ مگر وہاں دوسرا عالم ہی صغیرہ و کبیرہ اعمال اور تمام عالم کے ازل سے ابد تک کے اعمال حاضر ہوں گے۔ تو ایسے وقت جب کہ پورے عالم کا معاوضہ پورے نتائج کے ساتھ ہوگا اسی دن کو یوم الدین کہا گیا جہاں التباس نہیں ہوگا۔ تمام کتب سماویہ نے اس بات کی تعلیم دی ہے۔ کہ اس عالم کے بعد دوسرا عالم بھی ہے جس میں چھوٹے بڑے عمل کا پورے اہتمام اور نتائج کے ساتھ بدلہ دیا جائے گا۔ اور مالک کی صفت جو یوم کی طرف ہو رہی ہے اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ تمام مخلوقات کی متہادی جبر کو نکلتا ہے ان امور کا مالک نہیں کہا گیا۔ کیونکہ اس سے عظمت معلوم نہیں ہوتی۔ مگر جب اس دن کا مالک ہو تو اس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کر دی گئی۔ یہ دنیا ایک نشے کی طرح ہے۔ کہ جس سے نتیجہ نکلتا ہے۔ تو آخرت دنیا کے اعتبار سے بطور نتیجہ کے ہوئی۔ اور دوسری قرأت میں "مالک یوم الدین" کی بجائے "مالک الدیان" رکھتا ہے دیان کے معنی محاسب اور قاضی کے آتے ہیں۔ جو ہر فیصلے والے کی صفت ہے۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں فرمایا گیا فضم علی تبرا فرمایا گیا ہو۔ دیان هذه الامة یہ اس پہلے مطلب کے قریب بھی نہیں پھٹکتے

غرضیکہ جس نے مدد پڑھانے کی کوشش کی اس کو اپنے منہ کی کھانی پڑی۔ "مالک یوم الدین" میں اس عقیدہ کو بیان کیا گیا ہے جس کے آنے والے دن کے متعلق تمام کتب سماویہ نے خبر دی ہے۔ اس سے

toobaa-elibrary.blogspot.com

تناسخ یعنی آواگون والوں کا بھی رد ہو گیا کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک موت کے بعد کوئی عالم نہیں ہے بلکہ اسی جہان میں جزا و سزا ملتی ہے کہ اسے کسی کتے وغیرہ کے جسم میں بھیج دیا جاتا ہے لیکن یہ تو حماقت ہے کیونکہ دنیا کی کوئی بھی حکومت نہیں کرتی کہ ہر ایک کو پکڑ کر جیل میں داخل کر دیا جسے اپنے جرم کا بھی علم نہیں ایسی اندھیر نگری تو دنیا کی کسی حکومت میں نہیں ہے۔ چہ جائیکہ اس حقیقی حکومت میں ہو۔ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ نے بتلا دیا کہ دنیا میں کوئی جزا و سزا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لئے ایک ایسا دن آنے والا ہے۔ جہاں باقاعدہ شہادتیں ہوں گی۔ اپنے ہاتھ پاؤں اعضاء اور انبیاء علیہم السلام گواہی دیں گے۔ وہاں ہر مجرم کی خلاف ورزی سنا کر فرد جرم سنائی جائے گی۔ البتہ دنیا میں جو کسی جرم پر سزا دی جاتی ہے۔ وہ تنبیہ اور عبرت کے لئے ہوتی ہے۔ کہ مجرم پھر اس جرم کا ارتکاب نہ کرے تو یہ تب ہو سکتا ہے جب کہ اسے وہ جرم بتا بھی دیا جائے۔

معتزلہ جو کہتے ہیں کہ ان کے ہاں رحمت کی کوئی صورت ہی نہیں یعنی جرم معاف نہیں ہو سکتا ان کا بھی رد ہو گیا کہ۔ اللہ الرحمٰن الرحیم ہے۔ اور اس سے عیسائیوں کا بھی رد ہو گیا جو کہتے ہیں کہ جس نے باپ اور بیٹے کو مان لیا اس کا کفارہ مسیح علیہ السلام ہو چکے ہیں۔ لہذا ہم سب مغفور ہیں۔ مالک یوم الدین سے اس کا رد ہو گیا۔ اس طرح کہ ہمارے پیغمبر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صاحبزادی فاطمۃ الزہراؓ کو فرماتے ہیں کہ آخرت میں تم سے اعمال صالحہ پوچھے جائیں گے کہ فلاں بن فلاں جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ عیسائیوں نے اللہ تعالیٰ کا لقب اب یعنی باپ رکھا ہے۔ اور مسیح علیہ السلام کو بیٹا کہا۔ اور وہ مسلمانوں پر طعن کرتے ہیں۔ کہ ان کا کوئی اب یعنی باپ نہیں ہے جو ان پر شفقت کرے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا اب ہے اور اب کی شفقت عام ہوتی ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ باپ کی تربیت ایک محدود دائرے کے اندر ہوتی ہے۔ یہاں شفقت کے معنی کو الرحمٰن الرحیم سے ادا کیا گیا۔ ایسے ان نام نہاد خاکساری مسلمانوں کا رد بھی ہو گیا جو جنت کی آیات کو انگریزوں پر جن کے پاس حکومت ہے۔ اور دوزخ کی آیات کو مسلمانوں پر چسپاں کرتے ہیں۔ گویا کہ انہوں نے اس عالم دنیا کو یوم جزا قرار دیا۔ دنیا میں جب کوئی قوم بغاوت کرے تو حکومت ان میں سے بعض افراد کو گولی سے اڑا دیتی ہے بعض کو جیل میں ٹھونس دیتی ہے۔ پھر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ باقاعدہ شہادتیں ہوتی ہیں۔ مقدمہ باقاعدہ عدالت میں پیش ہو کر پھر سزا ملتی ہے۔ پھر جیلوں میں اگر کسی کو تنگی پہنچائی ہو تو فیصلہ سے پہلے اسے جیل میں تنگی پہنچائی

toobaa-elibrary.blogspot.com

جاتی ہے۔ اور جس سے رعایت کرنی ہوتی ہے اس کو راحت پہنچائی جاتی ہے۔ مگر یہ تو اندھیر گردی ہے۔ خداوندی رعایت تو ایک خاص قسم کی حکمت کا مقتضی ہوتی ہے۔ اگر دنیا کو ہی مجازات کا محل قرار دیا جاتے تو پھر وہ صحابہ کرام جو کفار کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ ملکہ ان کو پیس دیا گیا۔ تو کیا نعوذ باللہ یہ کہا جائے گا کہ وہ سب بدی کرنے والے تھے۔

الحاصل یہاں کی جزا درسزا تو ایک قسم کا نمونہ پھل ہے۔ اصلی سزا تو آخرت میں ہوگی اور یوم کی اضافت دین کی طرف اس لئے ہے کہ تجربہ سے واضح ہو چکا ہے کہ دنیا میں کوئی نعمت ایسی نہیں۔ جس میں کوئی کلفت نہ ہو اور کوئی کلفت ایسی نہیں۔ جس کے ساتھ نعمت نہ ہو سب سے بڑی نعمت سلطنت سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ سلاطین ہم سے زیادہ تکلیف میں ہوتے ہیں ایک فقیر کو تو یہ کہتا ہے۔ کہ فلاں سردار بہایت خوشی میں ہے۔ مگر اس سے پوچھو۔ وہ کہتا ہے کہ میرے جیسا کوئی معذب نہیں ہوگا چور کا۔ ور ڈاکو کا خطرہ زیادتی کی فکر۔ بیماری کا صدمہ۔ چنانچہ امریکہ کے ایک مالدار کا پچیس کروڑ روپیہ بینک میں جمع تھا اس کو ایک بیماری لگ گئی تھی چھاچھ کے علاوہ اسے کوئی غذا ہضم نہیں ہوتی تھی۔ اس نے اعلان کیا تھا۔ کہ اگر مجھے کوئی ایسی خوراک ہضم کرا دے تو اسے میں پچیس کروڑ روپے دے دوں گا تو معلوم ہو کہ دنیا دار سے زیادہ کوئی کلفت میں نہیں۔ اس لئے خالص نقمت اور خالص نعمت سوائے یوم الدین کے اور کہیں نہیں۔ نہ کوئی بیماری اور نہ کوئی کلفت اس خالص نعمت کے ساتھ ہے اور عذاب ایسا سخت کہ راحت کی گنجائش نہیں۔

الغرض جتنے بڑے اتنا خوف وہراس ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کے متعلق فرمایا گیا نحن معشر الانبیاء اشد ابتلاء ثم الامثل فالامثل، حدیث اس لئے یہ اعلیٰ خالص نعمت اور خالص عذاب ہوگا اسے یوم مخصص کہتے ہیں تاکہ امتیاز ہو جائے۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

اور جہنم کی آگ ایسی سیاہ ہوگی جو اس دنیا کی آگ سے کہیں زیادہ سیاہ ہوگی اور مالک کی اضافت یوم الدین کی طرف اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ملک اور ملک مجازی طور پر اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو دے رکھا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے تُؤۡتِی الۡمُلۡكَ مَنۡ تَشَآءُ

toobaa-elibrary.blogspot.com

اور جو مَلَكَتْ يَمَانُكُمْ اور فرمایا مَلَكُ الْمَوْتِ بعد ان تمام مقامات پر مالک اور ملک ظاہری طور پر ہو
سکتے ہیں۔ اگرچہ حقیقی طور پر وہ بھی مستغرق لئے گئے ہیں۔ لیکن جس دن یہ ظاہری اور مجازی پردے
اٹھ جائیں گے۔ محض اس ذات کے سوا اور کوئی بھی مالک نہ ہوگا۔ اور جب انسان ایک چیز کی زیادہ
تعریف کرتا ہے تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز گویا اس کے طور پر حاضر ہے۔ اور اشتیاق پیدا ہوتا ہے
ان صفات کی وجہ سے اور کبھی کبھی بے اختیار کہتا ہے۔ کہ ہم کہاں گئے۔ حق تعالیٰ کی تو وہ شان ہے۔
کہ ذرہ ذرہ سے اس کی ذات عیاں ہے۔ اور بندہ جب یہ تصور کرتا ہے۔ کہ میں اللہ تعالیٰ کے ملک
اور ملک میں محاط ہوں۔ تو بے ساختہ کہہ اٹھا کہ ایاک۔ واسطہ ایاک چاہیئے تھا۔ شعراء کے ہاں تخیل کو گویا کہ
محسوس فرض کیا جاتا ہے۔ یہی مطلب ہے۔ اس حدیث کا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
اعبد اللہ کانک تراہ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کرو گویا کہ تم انہیں دیکھ رہے ہو۔ اگرچہ دنیا
میں رؤیت باری نہیں ہو سکتی۔ مگر اس تخیل و محسوس کو فرض کر لیا گیا۔ تقدیم مفعول کی وجہ سے حصر کا
فائدہ حاصل ہوگا۔ جس سے اوروں کی نفی ہوگئی۔ کیونکہ تو ہی سب کا مالک اور ملک ہے تو ایاک نعبد
میں دو چیزیں ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا اثبات اور غیر اللہ کی نفی۔ تو ترجمہ ہوگا کہ ہم صرف تیری
ہی عبادت کرتے ہیں۔ تو اس طرح یہ کلام ماقبل کے کلام پر مرتب ہوگئی۔ مگر سکتے ایاک نعبد کے
لک نعبد کہا جاتے۔ تو اس سے یہ فائدہ تو ترتب حاصل نہیں ہوتا اگر کہا جائے تیرے لئے عبادت ہے۔
یعنی وہ تمہی عبادت تیرے لئے ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ اوروں کی عبادت کرنے والے بہت ہوں
گے بنسبت اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والوں کے۔ گر لام کو استحقاق کے لئے کہا جائے تو معنے
ہوں گے کہ تیرے لئے عبادت کا استحقاق ہے۔ مگر اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آیا یہ کہنے والا بھی
عبادت کر رہا ہے۔ اسی لئے لک العبادۃ کو ایاک نعبد کی بجائے رکھا ہے۔ مگر یہ ایاک نعبد
کے مضمون کے پاس بھی نہیں پھٹکتا۔ ایاک نعبد جمع متکلم لانے کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ کہنے والا ایک ہی
ہے۔ مگر اس میں بہت سے نکات ہیں۔

امام رازیؒ نے یہ لکھا ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمیں تلقین کی ہے کہ اگر بارگاہ ایزدی میں تم اپنی
عبادات کو پیش کرو۔ تو اس کے آداب یہ ہیں۔ اس لئے کہ فقہ کا مسئلہ ہے تفریق عقد کا۔ مثلاً دس
چیزیں خریدیں۔ ان میں ایک چیز ناقص تھی۔ مشتری کو جائز عیب ہوا کرتا ہے۔ اب اگر مشتری یہ چاہے کہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

یہ تو چیزیں تو ہیں رکھ لوں اور اس ایک کو واپس لے لو۔ اور اس کے ثمن دے دو۔

یہاں شریعت کا مسئلہ یہ ہے کہ یا تو سب کو خریدنا پڑے گا یا سب کو واپس کرنا ہوگا کیونکہ اس میں بائع کا نقصان ہے۔ اس لئے کہ وہ بائع اچھی بری سب اشیاء کو ملا کر بیچنا چاہتا ہے اگر خراب چیز اسے واپس کی جاتے۔ تو اسے کون خرید کرے گا۔ تو جب اللہ تعالیٰ جو سب سے بڑا عادل اور حکمت والا ہے۔ ہمارے سے تو ایسے چاہتے ہیں۔ اپنے لئے تو یہ طریق ادنیٰ سے پسند کریں گے۔ اس سے عبادت کرنے کا ادب سکھا دیا۔ کہ سب کے سب اپنی عبادات ملا کر پیش کرو۔ عباد کو بائع قرار دیا اگرچہ سب اشیاء الٰہی کی ہیں۔ اپنے آپ کو مشتری اور جنت کو ثمن فرمایا۔ تو جب ہم بندے نے کہا کہ ہم سب کی عبادت قبول فرمایئے جن میں انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام وغیرہم سب شامل ہیں۔ تو جب ہم صفقہ یعنی معاملہ یک کر رہے ہیں۔ تو مشتری کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اچھی اچھی لے لے اور خراب واپس کر دے۔ اور تمام کی عبادت کو ایک کہنا اس کی حکمت یہ ہے۔ کہ اس سے جتلانا یہ ہے کہ موحدین سب کے سب ایک کے حکم میں ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی عبادات بھی ایک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپؐ نے معاجزوں کو قنوت سکھلایا تو اَللّٰهُمَّ اهْدِنِي فِيْمَنْ هَدَيْتَ فرمایا کہ اے اللہ مجھے ان لوگوں کی ہدایت میں شامل کر جن کو آپ نے ہدایت دے رکھی ہے۔ اس گروہ کے متعلق شیخ اکبرؒ نے یہ لکھا ہے کہ اس سورۃ کا نام تعلیم المسئلہ بھی ہے۔ یعنی سورۃ فاتحہ عرضی کا مضمون ہے اور اس عرضی حقیقت کو پیش کرنے کے لئے نماز کا وقت تجویز کیا ہے۔ چنانچہ جب انسان عبادت کرتا ہے تو محض اس کی زبان ہی عبادت نہیں کرتی۔ بلکہ ہاتھ پاؤں بلکہ سب اعضاء اللہ تعالیٰ کے سامنے عبادت کر رہے ہیں۔ پس انسان سے تو یک لیکن اپنے ہر ہر عضو کو ایک مستقل عبد فرض کر لیا تو کہتا ہے کہ میں اپنے کل اعضاء کے ساتھ عبادت کر رہا ہوں چونکہ یہ عضو کثیر ہیں۔ اس سے جمع متکلم کا صیغہ لایا گیا۔ مگر بہتر توجیہ یہ ہے۔ کہ جب کوئی بادشاہ کسی تکلیف میں ہو۔ اور ایک آدمی جا کر کہے کہ جناب میری تمام خدمات آپ کے لئے پیش ہیں۔ تو اس سے اس بادشاہ کی عظمت ظاہر نہیں ہوتی۔ اور جب ایک آدمی یہ جا کر کہے کہ ہم سب آپ کی امداد کے لئے تیار ہیں تو اس سے بادشاہ کی عظمت ظاہر ہوگی۔ ایسے ہی اگر ایک بندہ کہتا ہے کہ میں آپ کی عبادت کرتا ہوں۔ اس سے عظمت الٰہی ظاہر نہ ہوگی اور جب یہ کہا کہ تمام دنیا کے عباد آپ کی عبادت کرتے ہیں۔ اس سے باری تعالیٰ کی عظمت بھی ظاہر ہوگی۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اور ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں اکیلا نہیں بلکہ میرے ساتھ دوسروں کی عبادات بھی ہیں۔ اب آپ کے شرمانے سے کہ ہم سب کی عبادت کو قبول فرمائیں

عبادت کے معنی غایت تذلل کے ہیں۔ مگر اس کی کوئی حد بھی ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عاشق جو ذلتیں برداشت نہیں کرسکتا، وہ معشوق کی خاطر برداشت کرتا ہے۔ لیکن اسے عبادت نہیں کہا جاتا، ورنہ یہی سے شرک کہا جائے گا۔ تو اس کے لئے کوئی معیار ہونا چاہیئے۔ فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی غیر اللہ کو تعظیمی سجدہ کرتا ہے، تو اس کے لئے یہ فعل حرام ہے۔ مگر ملت اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ اگر تعبّد یعنی عبادت کے طور پر کرتا ہے تو ملت اسلام سے بھی نکل جائے گا تو سجود کی تقسیم کر دی گئی۔ یہی وہ چیز ہے جو ان سعود کی قوم میں پائی جاتی ہے۔ کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ اور بیوی نکاح سے نکل جاتی ہے۔ اور ان کا حکم اصنام پرستوں کا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ طائف میں اس قسم کے اشتہار چھینکے گئے تھے۔ کہ قبر پرستوں کا حکم مشرکوں کا سا ہے۔ حضرت مولانا عثمانیؒ فرماتے ہیں۔ کہ میں نے ان سے کہا کہ آپ ان پر مشرکوں کا حکم کیسے لگا سکتے ہیں۔ اس لئے کہ کسی نبی کے دور میں شرک جلی کی اجازت نہیں دی گئی۔ لیکن بعض شرائع میں سجود غیر اللہ واقع ہوا ہے۔ جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا گیا۔ اگر ہر سجود عبادت ہے تو ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی عبادت کی اور حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں۔ لَا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ۔

باوجود اس کے آپ کے بھائیوں نے آپ کو سجدہ کیا تو وہ بھی مشرک ہوئے۔ اس سے کہ عبادت غیر اللہ جو کہ غایت تذلل سے عبارت ہے، سجود کو بھی مشتمل ہے۔ سا بریں ان شواہد نے فقہاء کرام کو مجبور کیا کہ وہ ان دونوں میں فرق کریں چنانچہ انہوں نے سجود تعبدی اور تعظیمی میں فرق کر دیا۔ اگرچہ سجدہ تعظیمی بھی ہماری شریعت میں غیر اللہ کے لئے جائز نہیں ہے سلطان عبد العزیزؒ نے حضرت مولانا عثمانیؒ کا یہ جواب سن کر فرمایا۔ کہ میں بہت خوش ہوا ہوں۔ لیکن میں عالم نہیں ہوں۔ آپ نے جو کچھ کہا قرآن مجید اور سنت نبوی کی روشنی میں کہا۔ میں اسے نہ تو قبول کرسکتا ہوں اور نہ انکار کرسکتا ہوں۔ آپ ہمارے ہاں کے علماء سے بحث و تمحیص کر کے کوئی فیصلہ کریں عبد العزیز کی گردن اس کے نیچے ہو گی۔

غایت تذلل کا معیار یہ ہے۔ جس پر حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے بحث کی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے بھی بحث کی ہے۔ مگر وہ منقح نہیں ہے۔ حضرت شاہ صاحب مرحوم نے لکھا ہے

toobaa-elibrary.blogspot.com

کہ عبادت اصل میں غایت خضوع اور تذلل کو کہتے ہیں لیکن غایت اور نہایت کا یہ مطلب ہے کہ اس میں عام طور پر دو چیزیں ہیں۔ ایک جوارح دوسرا قلب و روح اگر کوئی شخص ظاہراً کسی کے سامنے جھکتا ہے لیکن اس کے دل میں ہے تو یہ غایت تذلل نہ ہوگا۔ کیونکہ غایت تذلل کے معنی یہ ہیں کہ تذلل قلب اور جوارح دونوں کے اعتبار سے ہو کیونکہ یہ محل ہوتے ہیں۔ اور اس کا تمام عقیدہ یہ ہوتا ہے تو صورت بالا میں اس کا دل اس معبود کے لئے منقاد نہیں ہوگا بلکہ غایت تذلل تب ہوگا جب کہ اس کا قلب بھی منقاد ہو۔ مثلاً کوئی بیٹا باپ کی تعظیم قلب اور ظاہر اً کرتا ہے۔ مگر وہ خیال کرے کہ میرے باپ کو کوئی قدرت حاصل نہیں ہے بلکہ یہ کسی اور کی دی ہوئی ہے۔ تو حقیقی یہ تعظیم اپنے باپ کی کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ اس ہستی کی ہوگی جس کے ہاتھ میں نفع و ضرر ہے۔ تو عبادت کے معنی ہوئے۔ کہ کسی ہستی کے سامنے تذلل اور خضوع جوارح سے ہو اور اس کی عظمت قلب میں ہو اس عقیدہ کے ساتھ کہ نفع و ضرر اس کے ہاتھ میں ہے اور اس کو مستقل اختیار ہے جو شخص اس طریقہ پر کسی غیر اللہ کی عبادت کرے۔ تو یہ مشرک ہوگا اگر کسی کا یہ عقیدہ نہیں لیکن خضوع اور تذلل ہو۔ تو اسے مشرک نہ کہا جائے گا بلکہ جاہل اور احمق کہا جائے گا۔

البتہ یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ مشرکین مکہ بتوں کی عبادت کرتے تھے لیکن ان کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ یہ مختار اور عامل ہیں۔ بلکہ انہیں چھوٹے چھوٹے حاکم اور شفیع سمجھتے تھے۔ اور بڑے خدا کے قرب کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔ آیات قرآنیہ سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ تو تصرفات تکونیہ میں انہیں مختار نہیں سمجھتے تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ لوگ ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے تھے۔ کہ ہم ان کی عبادت اس لئے کرتے ہیں۔ تاکہ ہمیں قریب کر دیں۔ تو وہ اپنے عقیدہ کے مطابق ان کے لئے ایک مستقل اختیار سمجھتے تھے گرچہ وہ اس کے مستحق نہیں تھے۔ مگر جو مستحق نہ ہو۔ اس کی عبادت کا اقرار کرتے تھے۔ جیسے کلکٹر، اور ڈپٹی کمشنر وغیرہ کو اختیارات حکومت کی طرف سے تفویض ہوتے ہیں۔ اگرچہ مستقل نہیں۔ مگر وہ ان کے نفاذ اور ان کی حدود میں تقسیم کرنے کے لئے مختار ہیں ان کے نفاذ کے لئے پھر حکومت سے نہیں پوچھتے۔ مشرکین مکہ کا عقیدہ کچھ ایسا ہی تھا۔ کہ بڑا خدا جس نے زمین و آسمان وغیرہ جو ان چھوٹے خداؤں کی قدرت میں نہیں ہیں۔ مستقل اختیار تو اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ البتہ اس نے یہ اختیار تقسیم کر دیا ہے۔ پھر وہ ہر ایک بت اپنے حصے میں مستقل اختیار ہے۔ اگرچہ ماتحت ہیں۔ یعنی بالکلیہ تو شرک نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان چھوٹے خداؤں کے لئے مستقل الاختیار ماتحت ہونا ہی سمجھتے تھے جیسے آج کل کے ہندو پینتیس ۳۵ کروڑ دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ بھی اسی عقیدہ پر۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

مگر ہمیں یہ معلوم نہیں کہ کسی کو بھی ایک ذرہ کا اختیار نہ دیا ہو۔ یہ تقسیم ہیں۔ تشریعی میں اور یہی تکوینی میں ہے۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھتے ہوئے تذلل اور خضوع کرے تو اسے مشرک نہ کہا جائے گا۔ جب تک کسی کے لئے مستقل اختیار نہیں مانتا مشرک نہ ہوگا۔ یہ تکوینی اختیار ہے۔ اور ایک تشریعی قانون ہے۔ یعنی حلال و حرام کرنا۔ اگر کسی نبی یا ولی وغیرہ کے لئے یہ عقیدہ رکھے کہ اس کو حلال و حرام یعنی یہ قانون بنانے کا مستقل اختیار ہے۔ تو وہ بھی مشرک ہوگا۔ جیسے کہ قرآن مجید میں ہے۔

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔

جس پر حضرت عدیؓ بن حاتم طائی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ کوئی نصرانی اور یہودی اپنے آپ کو خدا نہیں کہتا۔ پس آپ نے فرمایا کہ کیا جس چیز کو یہ احبار اور رہبان بغیر کسی دلیل کے حرام قرار نہیں دیتے تو تمام عیسائی ان کے لئے تحلیل اور تحریم کا اختیار مانتے ہیں۔

الغرض جو شخص کسی کے لئے بقاء، احداث، تکوین، تشریع میں مستقل اختیار مانے تو وہ مشرک ہوگا۔ اگر کوئی اصنام کو خدا مانے اور ان کے لئے وہ اختیار مانے۔ چونکہ یہ شعار کفار ہے۔ لہذا جو کسی بت کی عبادت کرے تو یہ توحید کا انکار کر رہا ہے جس طرح کسی کے ہاتھ میں ترنگا جھنڈا اور دوسرے کے ہاتھ میں سبز اور تیسرے کے ہاتھ میں سرخ ہو۔ تو اگرچہ اس جھنڈے پر لکھا ہو کچھ نہیں ہے۔ مگر اس سے سمجھا جاتا ہے کہ یہ فلاں جماعت کا عقیدت مند ہے۔ پس بتوں کو سجدہ کرنا چونکہ کفار کا شعار بن چکا ہے جس کو فقہاء نے کفر لکھا ہے۔

سجدہ تعظیمی جیسے استاد کے آگے جھک دینا اگرچہ پہلی شرائع میں جائز تھا لیکن شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے کیونکہ شریعت اسلامیہ وغیرہ بھیجنے کا مقصد توحید باری تعالیٰ کو ثابت کرنا اور پھیلانا ہے۔ پہلی شرائع میں تصویر وغیرہ بنانا جائز تھا۔ جب لوگ اس کو سجدہ تعظیمی کرتے کرتے بتوں کی عبادت تک پہنچ گئے۔ تو توحید میں رخنے ڈال دیئے گئے۔ چونکہ ہماری یہ شریعت حقہ ہے۔ اور اس کے بعد کسی شریعت نے آنا نہیں۔ اس نے شرک کے جتنے مقامات اور صورتیں ہو سکتی تھیں سب کی جڑوں کو کاٹ دیا گیا۔ چنانچہ ماشاء اللہ وشئت ظاہر کے اعتبار سے صحیح ہے کیونکہ کسی بھی پہ یہ گمان نہیں کیا جا سکتا۔ مگر آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اور فرمایا جعلتنی للہ ندا کیا تم نے مجھے اللہ کا شریک بنا دیا۔ بلکہ آپ نے فرمایا یوں کہو ما شاء اللہ وحدہ سب امور اس کی مشیت کے تحت

toobaa-elibrary:blogspot.com

دل میں تو صرف یہ ہو کہ عبادت غایت خضوع و تذلل قلب اور اس کے ساتھ مستقل اعتقاد رکھنے کو عبادت کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے۔

رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ یعنی جب کشتی اور جہاز دریا میں ڈوبتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ حضرت مولانا تھانوی جب جہاز سے واپس تشریف لا رہے تھے تو جہاز میں قادر مطلق کو پکارنے کی بجائے نام نہاد مسلمان یا شیخ عبدالقادر جیلانی پکارتے تھے۔

امام شوکانی نے لکھا ہے کہ جب مشرکین ایسے موقع پر غیر اللہ کو نہیں پکارتے تھے۔ لیکن یہ نام نہاد مسلمان تو ایسے موقع پر بھی غیر اللہ کو پکارتے ہیں اس کا کیا حال ہوگا تو حضرت مولانا تھانوی فرماتے ... مشرکین سے تو تقسیم کر دیا ہے مگر یہ جاہل بدعتی کہتا ہے کہ یہ اولیا مقرب الی اللہ ہیں گرچہ مستقل اعتقاد تو نہیں رکھتے کہ یہ رب مقرب ہیں۔ ہوگا تو مستقل نہ سہی تابع ہی ہو، واسطہ ہوں گے۔ یہ حسن ظن ہے مگر دل میں کوئی ایسا سمجھتا ہے تو پھر وہ ان مشرکین میں داخل ہوگا۔

عبادت یعنی غایت خضوع و تذلل یہ ہو تو کسی کے کمال کی وجہ سے ہوگا ناقص آدمی جس کے سامنے جھکتا ہے یہ ایک نرالی بات ہے یا کبھی جمال کی وجہ سے جھکتا ہے اس کے لئے بہت ذلتیں برداشت کرتا ہے جیسے کسی ایک صورت پر عاشق ہے۔ جس کے لئے ذلتیں برداشت کرتا ہے۔ جیسے لیلیٰ کو عاشق نے کہا تھا۔ جیسے مولانا روم نے نقل کیا ہے۔ اور کبھی احسان کی وجہ سے جھکتا ہے۔ حتیٰ کہ جانور ... بھی احسان مند ہوگا۔

چنانچہ ایک واقعہ ہے کہ خلیفہ مامون رشید نے ایک دفعہ امام جعفر سے کہا کہ اگر آپ ... ہو تو ہم آپ کی ... کریں گے۔ تو اس نے خلیفہ مامون سے کہا کہ تم میرے بیٹے سے محبت ... کہا کہ یہ محبت عبادت کا نام نہیں ہے۔ جعفر نے جواب دیا۔ اگرچہ محبت عبادت نہیں ہے مگر وسائل عبادت میں ہیں وہ یہ ہے کہ آپ کثرت سے اس پر احسان کریں تو وہ ممنون احسان ہو کر آپ سے محبت کرنے لگا چوتھا ذریعہ یہ ہے کہ کسی خوف یا طمع سے جھکے۔ جیسے کسی حاکم کے سامنے جھکتا۔ اگر چاروں میں اس کو کچھ بھی کہتا ہو تو طاعت کے چاروں وجوہ ہو گئے۔ تو جس ذات میں یہ چاروں صفات پائے جائیں وہ کامل طور پر اس بات کی مستحق ہے کہ جتنے تذلل و خضوع کے درجے ہیں وہ سب اس پر ختم کر دیئے جائیں۔

تو ایک نعبد کے بعد کہا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

استعانت کا معنی مدد حاصل کرنا۔ مدد مانگنا۔ تو ہمارے محاورت میں اس معنی کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ کہ جو مدد حسب عقیدہ ہو۔ مگر استعانت عام ہے۔ جیسے قلم سے مدد حاصل کرنا۔ اس پر شبہ یہ ہوتا ہے کہ ایاک کی تقدیم حصر کا فائدہ دیتی ہے۔ تو حصر قلب صحیح ہو سکتا ہے۔ جب کہ غیر اللہ سے بالکل مدد حاصل نہ کی جائے۔ حالانکہ قلم وغیرہ سے مدد حاصل کی جاتی ہے۔ دراصل حاصل کرنے کے لیے کتنی اشیا مشغول ہیں۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

غرضیکہ یہ حقیقی اشیا ہیں وہ سبب سے اور ان اسباب کے سبب ہیں۔ اور اسباب بعید ہوتے ہیں تو غیر اللہ سے مدد حاصل ہوتی ہے۔ دلائل اس پر شاہد ہیں۔

جواب یہ ہے کہ ایک استعانت حقیقی ہوتی ہے۔ کہ مستعان کے قبضہ میں ہو۔ اور اس کے عقیدہ اور قدرت میں ہو جو چاہے کرے یا نہ کرے۔ اگر اس حیثیت سے مدد حاصل کی جائے کہ وہ واسطہ ذریعہ ہے۔ اس بندہ کا جو مستعان حقیقی سے پہنچتا ہے۔ اسے استعانت ظاہری کہتے ہیں۔ جیسے آتشی شیشہ آفتاب کی حرارت کو جذب کر لیتا ہے۔ جب سبز کپڑا وغیرہ اس کے سامنے لایا جائے۔ تو وہ جل جاتا ہے تو آگ اس شیشہ سے لگتی ہے۔ اگر یہ شیشہ نہ ہوتا۔ تو دھوپ میں کبھی کپڑا نہیں جلتا۔ مگر اس آتشی شیشہ میں حقیقی حرارت نہیں۔ بلکہ اس حرارت کا معدن آفتاب ہے۔ شیشہ اس کا واسطہ اور ذریعہ ہے۔ کہ قدرت نے اس میں ایک ایسی چیز رکھی ہے کہ جس کے ذریعہ وہ شمس کا فیضان پہنچاتا ہے۔ جیسے چاند جب روشنی پھیلاتا ہے۔ تو کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس چاند نے چاندنی پھیلائی۔ مگر حقیقت میں یہاں تک کہ تمام حکما، یونان نے کہا کہ چاند کا نور شمس کے نور سے مستفاد ہے۔ اہل کشف، سائنسدانوں، حکماء اور علماء سب کا اتفاق ہے کہ چاند کا نور مستفاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو گہن اس لیے لگتا ہے۔ کہ سورج اور چاند کے درمیان زمین حائل ہو جاتی ہے۔ تو دنیا میں جتنی اشیاء ہیں۔ ان کے لیے اسباب ہوتے ہیں۔ جو کہ وسائل ہوتے ہیں۔ گھڑی کی مشین اس میں کتنے پرزے ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلے حرکت ایک پرزے کو ہوتی ہے اس کے ذریعہ پھر دوسرے پرزے حرکت کرتے ہیں۔ تو در حقیقت فیضان اس کا ہوگا۔ جو سب سے پہلے ہوتا

toobaa-elibrary.blogspot.com

حقیقت میں استعانت تو اس ذات باری تعالےٰ سے ہوئی۔ وسائل اور اسباب سے استعانت ظاہری ہوئی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص بادشاہ یا امیر کے ہاں مہمان ہو۔ تو وہ اپنے مہمان کے لئے اپنی طاقت کے مطابق انتظام کرے گا۔ کھانے پینے، موٹر والے، پاسبان۔ الغرض سب کو ہدایات کر دیں۔ یہ سب نوکر چاکر اس مالک کے ہیں۔ ان میں سے اگر کوئی کام کرنے سے انکار کر دے تو مالک بہت شرمندہ ہوگا۔ اگر مہمان کسی دوسرے آدمی سے کام لے جو اس کے لئے متعین نہیں کیا گیا، تو یہ خلاف عادت ہوگا۔ البتہ جو کام ان نوکروں کے بس میں نہیں ہے۔ تو میزبان سے بلا واسطہ گفتگو کرنی پڑے گی۔ ایسے اگر باورچی کو کہا جائے، کہ تم بہت ساکھانا پکا کر دو، تاکہ میں پارسل کر دوں۔ تو وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ بس کا ایک محدود دائرہ ہے۔ جس میں وہ کام کرے گا بعینہٖ ایسے ہی آدم مہمان ہیں۔ اور دنیا کی سب اشیاء، اس کے لئے نوکر چاکر ہیں۔ تو وہ اپنے دائرہ کے اندر رہ کر خدمت کریں گے۔ مگر ان اسباب سے وہ کام لیا جائے گا۔ جس کے لئے یہ سبب بنائے گئے ہیں۔

اسباب دو قسم ہیں ایک طبعیہ۔ جیسے دوا کھانے سے مریض کو فائدہ ہو۔ پانی سے پیاس بجھتی ہے دوسرے شرعی اسباب ہیں۔ جن ہمیں تجربہ سے معلوم نہیں۔ مگر انبیاء اور اطباء روحانی سے معلوم ہوئے جیسے دعا سبب ہے۔ یہ طبعی نہیں بلکہ شرعی سبب ہے۔ ان دونوں قسم کے اسباب چھوڑ کر کوئی دوسرے قسم کے اسباب سے استعانت کرے گا تو وہ احمق ہوگا۔ جیسے قبر پر جاکر اولاد مانگنا یہ اسباب شرعیہ میں سے نہیں۔ کیونکہ کسی نبی اور ولی نے یہ نہیں کہا کہ قبر پر جاکر اولاد مانگو۔ اور نہ ہی اطباء نے کہا ہے کہ قبر پر جاکر دوا مانگو تو جو ان اسباب سے مدد لے گا، تو وہ ان اسباب کے مالک یعنی مسبب الاسباب سے مدد حاصل کر رہا ہے۔ صحابہ کرام میں سے کسی نے یہ نہیں کہا، کہ وہ مزار نبوی پر پہنچ کر کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں۔ کسی نے یہ نہیں کہا۔ کہ اے نبی! مجھے اولاد دو۔ ایسے نفع کرنے والا توہمات کا تابع ہے جیسے ملا احسان صاحب نے ایک درخت کو آم تصور کرکے خوشامد کرنی شروع کی۔ وہ چوہدری صاحب کہنے لگے۔ جب بجلی کی روشنی ہوئی۔ تو معلوم ہوا کہ وہ درخت تھا۔

ایسے ہندو مشرک پیپل وغیرہ کی عبادت کرتے ہیں۔ وہ بھی توہمات کے ماتحت کرتے ہیں اور جب وہ مہمان خدمت ہوگا تو نوکر چاکر کا شکریہ ادا نہیں کرے گا اگر شفقت کرے گا تو دو چار روپے انعام کے طور پہ دے دے گا۔ لیکن شکریہ کی چٹھی مالک کو لکھے گا۔ اسی طرح بادل، سورج، چاند وغیرہ انسان مہمان

toobaa-elibrary.blogspot.com

کے لئے نوکر چاکر مقرر کئے گئے ہیں۔ یہ ان کی طرف سے نہیں۔ بلکہ یہ سب مالک حقیقی کی مدد سے نفع پہنچا رہے ہیں۔

ایں ہمہ ہر تو سر گشتہ و فرمانبردار
شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرمان نبری

صرف اللہ کی عبادت اور صرف اللہ تعالٰی سے مدد حاصل کرنا یہی ہے۔ کہ تمام اسلام کا دارومدار اسی پر ہے۔

جبریہ کہتے ہیں کہ انسان مجبور محض ہے اور قدریہ کہتے ہیں کہ انسان ہر فعل پر قادر ہے۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ سے دونوں استدلال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دیکھو انسان عبادت کو اپنی طرف منسوب کر رہا ہے۔ جبریہ نے کہا کہ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کو دیکھو۔ جبر و قدر کے درمیان اہل سنت والجماعت دونوں کو ملا کر کہتے ہیں کہ یہ بار مستقل ہے نہ بندہ مجبور ہے اور نہ مختار ہے جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا۔ کہ انسان مجبور ہے یا مختار ہے تو آپ نے فرمایا کہ ایک ٹانگ کو اٹھا کر کھڑا ہو جا۔ پھر فرمایا دوسری ٹانگ کو اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ تو اس نے کہا یہ تو نہیں ہو سکتا۔ جس پر آپ نے یہ فرمایا کہ بس انسان بھی یہی ہے کہ اس کو ایک ٹانگ قدرت اختیار کی اور دوسری ٹانگ جبر کو لگی ہوئی ہے۔

اس بے بسی پہ ذوق بشر کا یہ حال ہے
پھر کیا کرے گا جب خدا اختیار دے

الحاصل ﷺ ایاک نعبد سے اس چیز کا بیان ہے جو ادھر سے مطلوب ہے اور ایاک نستعین سے اس چیز کا بیان ہے جو ادھر یعنی عبادت سے مطلوب ہے۔ حمد ہمیشہ احسان اغلب پر ہوتی ہے اس نے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے جواب میں فرمایا تھا کہ حمدنی عبدی میرے بندے نے میری تعریف بیان کی۔ اور جب اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہا۔ اثنا علی عبدی فرمایا۔ اور جب مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کہتا ہے۔ تو فرماتے ہیں مجدنی عبدی۔ میرے بندے نے میری بزرگی اور عظمت کو بیان کیا اور جب اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کہتا ہے تو فرماتے ہیں۔ ھذا بینی و بین عبدی ولعبدی ما سأل کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان معاہدہ ہے۔ میرے بندے نے

toobaa-elibrary.blogspot.com

جو کچھ میرے سے مانگا اس کو مل کر رہے گا۔ نصرانی نے اس کی بجائے لک العبادۃ و بک المستعان میں نہ تو بندے کا عبادت گذار ہونا معلوم ہوتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کا مستعان اور معبود ہونا معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کو آلہ اور ذریعہ بنایا گیا۔ یہ صریح نہیں کہ جس سے معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ مستعان ہے۔

استعانت مدد حاصل کرنا۔ اس کی ضرورت تب پڑتی ہے۔ جب کہ وہ کام کسی کی طاقت میں نہ ہو۔ ورنہ اگر کسی کی قدرت میں ہو۔ تو دوسرے کو نہیں کہے گا۔ جیسے قلم کو اٹھانا استعانت میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک تو اپنی کوشش کہ جس کو وہ خرچ کر چکا۔ مگر اس سے تکمیل نہیں ہوتی اس لئے دوسرے سے مدد طلب کرتا ہے اگر اس کی طاقت میں ہو۔ تو پھر کسی سے مدد طلب نہیں کرتا۔ البتہ جو کاہل مشہور ہو۔ جیسے نکھٹو کے تشہ دنوں کا واقعہ مشہور ہے۔ تو ان کی تو بات نہیں۔ مگر جو آدمی ہو گا۔ وہ اپنی طاقت کے مطابق ضرور کوشش کرے گا۔ بے تیار کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ أَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم فرمان ربانی ہے۔ جس طرح کاشتکار کھیتی کرتا ہے۔ ہل چلانا۔ بیج ڈالنے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ سے مدد کا طالب ہو گا۔ وجہ یہ ہے۔ کہ بعض اشیاء کے اسباب ایسے ہوتے ہیں جو ہمارے اختیار میں ہوتے ہیں۔ اور بعض محجوب ہوتے ہیں۔ اور بعض جمع ہوتے ہیں۔ مگر موانع رفع نہیں ہو سکتے۔ جیسے ریل گاڑی۔ اگرچہ اس کا ٹائم ٹیبل مقرر ہوتا ہے مگر حادثہ پیش آجانے کی وجہ سے وقت پر نہیں پہنچ سکتی۔ تو چونکہ بعض اسباب ایسے ہیں کہ ان کے لئے موانع ہیں۔ موانع کو رفع کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی جاتی ہے تو یاک نستعین آدمی کو کاہل نہیں بناتی۔ بلکہ یہ تعلیم دیتی ہے۔ کہ پہلے اپنی کوشش کرو۔ پھر مدد طلب کرو۔ اس لئے پہلے ایاک نعبد رکھا گیا کہ ہم سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ تو ہم کرتے ہیں۔ حکم بجا لاتے ہیں۔ مگر اس کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے۔ بنا بریں آپ سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے حضرت شیخ الہند سے مولانا عثمانی مرحوم نے فرمایا تھا۔ کہ کیا آپ یک دم انقلاب برپا کر دیں گے۔ اور تمام سلطنتوں کو درہم برہم کر دیں گے۔ تو آپ نے جواباً فرمایا کہ بندہ کا تو یہ کام ہے کہ جو کوئی معاملہ پیش آئے تو پہلے خود دیکھ لے سے سوچ لے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اس کے چھوڑنے میں ہے یا کرنے میں ہے۔ اگر اس کے نزدیک متعین ہو جائے۔ کہ مجھے یہ کام کرنا ہے۔ پھر لگا رہے جیسے کسی آدمی سے اللہ تعالیٰ فرمائیں کہ تم آسمان پر چڑھو۔ تو پہلے وہ چارپائی سے اٹھے۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکے اوپر کو چڑھے پھر استعانت طلب کرے۔ شیخ عطارؒ نے ایک واقعہ لکھا ہے۔ کہ ایک آدمی پہلے تیاری کر کے جمعہ کی نماز کے لئے جاتے تھے۔ مگر جامع تک پہنچ کر واپس آجاتے تھے۔ اور

toobaa-elibrary.blogspot.com

کہتے تھے۔ کہ میری قسمت میں اتنا تھا۔ آگے کا معاملہ آپ کے سپرد ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ توکل نہیں ہے کہ وسائل کو چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ اسے تعطل کہا ہے۔ الغرض شرعاً اسباب کو معطل کرنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ اپنی بھرپور طاقت صرف کر کے پھر اللہ سے مدد طلب کرے۔

اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ سے جو استعانت سمجھی جاتی ہے۔ اس میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ استعانت تمام امور میں ہے۔ اور یہی صحیح ہے کہ خیر کے امور میں مدد طلب کی جائے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ عبادت کے متعلق استعانت طلب کی گئی ہے۔

عبادت دو قسم ہے۔

۱۔ جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفت حکومت سے ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ حاکم مطلق ہے۔ تو ہم محکوم مطلق ہوگئے۔ اس صفت حکومت کے لئے بعض عبادات مظہر بنتی ہیں۔ اور بعض عبادات ایسی ہیں۔ کہ جن کا تعلق صفت محبوبیت سے ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ کہ ایمان والے اللہ تعالیٰ سے سخت محبت رکھنے والے ہیں۔ دنیا میں اگر کسی کی اطاعت کی جاتی ہے۔ تو وہ اسی وجہ سے یعنی کبھی محبت کے جذبہ سے۔ جیسا کہ عاشق کا معشوق کی اطاعت کرنا۔ اور کبھی کسی کے قہر و غضب سے۔ یعنی جلب منفعت اور دفع مضرت کے لئے اور محبت کے اسباب بہت سے ہیں۔ دو عبادتیں یعنی صلوٰۃ اور زکوٰۃ ان کا تعلق صفت حکومت اور جلال سے ہے حج اور روزہ ان دو عبادتوں کا تعلق صفت محبوبیت اور جمال سے ہے۔ تو دو عبادتیں جلالی اور دو جمالی ہوئیں۔ ان عبادتوں میں سے جو مظہر حکومت بنتی ہیں۔ ان میں سے افضل اور اکمل صلوٰۃ ہے۔ کہ اس میں بادشاہ کے حضور کے آداب سکھلائے جاتے ہیں۔ اس میں اور تو بہت سی چیزیں ہیں۔ مگر ان میں سے ایک معروض بھی ہے۔ کہ پہلے القاب۔ پھر سلام و آداب۔ اس کے بعد عرض مطلب زبان پہ لایا جاتا ہے۔ اب اس ذیل میں سے کو اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرضی پیش کرنی تھی۔ اور اسے اس کے آداب معلوم نہیں تھے۔ اور اس کے القاب ہمیں معلوم نہیں تھے۔ جیسے ایک بیٹے نے اپنے باپ کو قبلہ و کعبہ اور نجف اشرف وغیرہ کے القاب لکھے۔ تو اللہ تعالیٰ کے القاب سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کون بتلاتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ کو نقاب بنا کر نازل فرمایا۔ الحمدللہ سے اس کے القاب پھر اپنی عبودیت اور غلامیت ثابت کی۔ القاب تک تو بادشاہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

اس کے بعد اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے جواب میں فرمایا۔ ھٰذا بینی و بین عبدی ولعبدی ما سأل۔ پھر اس نے کہا۔

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ

یہی سورۃ فاتحہ سے مقصود ہے۔ اس لئے اس سورۃ کو تعلیم المسئلہ بھی کہتے ہیں۔ تو اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔ ھٰذا لعبدی اور مزید فرمایا ولعبدی ما سأل۔

اھدنا میں جمع کے صیغہ کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں انسان کی زندگی اجتماعی ہے۔ کیونکہ اگر ایک آدمی متقد ہو تو سب سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتا اگر لڑے نہیں تو ضمیر فروشی ہوگی۔

ھدایت معنیٰ اصلی الدلالۃ بلطف علی ما یوصل الی المطلوب ہیں۔ اس کو مصنفین اراءۃ الطریق سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ معنی عام ہیں۔ آگے اگر چلنے والے کی قسمت ہوگی تو پہنچ جائے گا۔ ورنہ نہیں۔ اسی معنی میں اما ثمود فھدینٰھم الایۃ میں اس ہدایت کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس ہدایت کے مراتب ہیں۔

۱۔ الہام فطری۔ وجدان طبعی کی ہدایت یعنی انسان اور حیوان کی فطرت ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ بعض اشیاء کی طرف ہدایت پاتا ہے۔ جیسے بچے کو جب بھوک لگے۔ تو وہ روتا ہے۔ حالانکہ اسے کسی نے سکھلایا نہیں۔ اور اس وقت اس کے پاس قوی نہیں ہیں حتیٰ کہ سمع و بصر بھی ناقص ہوتے ہیں۔ تو روتا ہے اور آثار سے ماں سمجھ لیتی ہے۔ کہ اسے بھوک لگی ہے۔ تو وہ اسے اپنی چھاتی سے لگاتی ہے۔ تو وہ اسے چوستا ہے۔ یہ چوسنا وغیرہ اس کو کسی نے نہیں بتایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں رکھ دیا ہے۔

۲۔ ہدایت حواس کی حواس ظاہرہ۔ جیسے سامعہ۔ باصرہ وغیرہ۔ اور مشاعر یعنی حواس باطنہ۔ جیسے عقل۔ وہم حس مشترک وغیرہ۔ بچہ کے پیدا ہونے کے وقت سے یہ حواس بڑھتے رہتے ہیں۔ پہلے یہ ضعیف ہوتے ہیں حیوانات میں یہ حواس جلدی ترقی کرتے ہیں۔ مگر انسانوں میں آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہیں۔ اور ان کے حواس غلطی کرتے رہتے ہیں۔ جیسے دور سے لالٹین کو دیکھے تو اسے قریب سمجھ کر پکڑنا چاہتا ہے۔ بلکہ بڑے آدمیوں کے حواس بھی غلطی کرتے ہیں۔ جیسے بعض حکما نے زمین کی حرکت کو تسلیم کیا ہے۔ مگر حواس سے وہ حرکت معلوم نہیں ہوتی۔ اور جب بادل متحرک رہتے ہوں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند چل رہا ہے۔ حالانکہ وہ بادل چل رہا ہوتا ہے۔ بہرحال یہ حواس اپنے دائرہ میں محدود رہتے ہیں۔ پھر بھی اس میں غلطی کرتے ہیں۔ اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا

toobaa-elibrary.blogspot.com

ذ۔ مناکھو ذ۔ اس مرتبہ میں استعمال کیا گیا ہے۔

۴۔ جہاں حواس کام نہیں کر سکتے بلکہ عقل کے ذریعے ان اشیاء کا ادراک ہوتا ہے۔ بعض اشیاء ہیں کہ وہ حواس خمسہ کی حدود میں نہیں۔ جیسے کلیات کا ادراک۔ اور دوسرا یہ ہے کہ جہاں حواس غلطی کرتے ہیں۔ مگر عقل ان کو متنبہ کرتی ہے۔ لیکن یہ عقل بھی غلطی کرتی ہے۔ اور اس کے لئے بھی ایک حد ہے کہ عقل اس سے باہر نہیں جا سکتی۔ تو جیسے بعض اشیاء ہیں کہ جہاں تک حواس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ بعض اشیاء ہیں کہ وہاں تک عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کی کنہ تک پہنچنا

جو ذہن میں گھر گیا وہ لا انتہا کیونکر ہو
جو سمجھ میں آگیا وہ خدا کیونکر ہوا

اسی طرح عالم آخرت کا ادراک عقل سے نہیں ہو سکتا۔ دوسرے جیسے حواس غلطی کرتے ہیں عقل بھی غلطی کرتی ہے۔ ورنہ تمام عقلاء ایک بات پر متفق ہوتے۔ حالانکہ کوئی عالم کے حدوث کا قائل ہے اور کوئی اسے قدیم کہتا ہے۔ یہاں تک اختلاف ہے کہ جن اشیاء کو تم موجود کہتے ہو وہ موجود نہیں۔ بلکہ بعض اسے بدیہی کہتے ہیں۔ غرض جس مسئلہ میں دس مذاہب ہوں گے۔ ان میں سے ایک تو صحیح ہوگا باقی غلط ہوں گے۔ تو عقل کی ذلت یعنی لغزش حواس ظاہرہ سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ کہ وہ بہت ٹھوکریں کھاتی ہے۔ اس لئے اس کے لئے ایک چوتھی ہدایت ہے۔ کہ جہاں تک عقل کی روشنی نہیں پہنچ سکتی۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور کتب آسمانی کے ذریعہ ہدایت فرمائی ہے۔ تو یہ ان سب سے نجات دلاتی ہے۔ وہ دین۔ وحی اور انبیاء علیہم السلام ہیں۔

۵۔ یہ ماقبل کی سب اشیاء ہیں۔ مگر عقل کے ماسوا اور قوتیں بھی۔ درندگی۔ غصہ وغیرہ انسان میں ہوئی ہیں۔ چنانچہ شہوات و درندت وغیرہ اس عقل کو پھیر دیتی ہیں۔ کھانا ناجائز اور قبیح اشیاء کو جائز حسن بنا کر اس کے ارتکاب کرنے میں مجبور کرتے ہیں۔ جیسے عرب نے اپنے کارنامے غارت گری۔ خونریز وغیرہ پر فخر کرتے ہیں۔ اور آج کل بازاری اور پیشہ ور عورتیں اپنے زنا کرانے پر مفاخرت کرتی ہیں یہ لذ وغیرہ محض عوام کی عقول پر غالب نہیں آتیں۔ بلکہ علماء کا طبقہ بھی اس کا مرتکب ہوتا ہے۔

چنانچہ مصر کے ایک مولوی کا واقعہ مشہور ہے۔ ایسی ہدایت کو توفیق۔ ارشاد۔ عنایت ایزدی کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن و احادیث سے اپنے مطلب کو ثابت کرتے ہیں۔ اسی چیز کو خلوص قلب کے سا

toobaa-elibrary.blogspot.com

اللہ تعالیٰ سے اھدنا الصراط کی دعا کرنی چاہیئے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے التجا اور اسی کی پناہ ڈھونڈے۔

یہ ایک نور ہے جس کو اللہ تعالیٰ چاہے اس کے دل میں ڈال دے۔ یہ اسے منزل پہ پہنچاتی ہے۔ اسی کو قرآن مجید میں فرمایا گیا۔ فبھداھم اقتدہ الایۃ۔ اسے عنایت الٰہیہ کہتے ہیں۔

۹۔ یہ سب چیزیں پائی جائیں مگر اس پر کیا اطمینان ہے۔ کہ جو چیز آج ہمیں قرآن مجید میں صحیح معلوم ہوتی ہے، وہ کل ہمارے پاس نہ رہے۔ حتیٰ کہ جو چیز پہلے سے سمجھی ہوئی تھی۔ اس کی باہر کے آثار سے تاویلات کرنی شروع کرتا ہے۔ یعنی اس پہ قائم نہیں رہتا۔ تو اس کے لئے دعا مانگتا ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا۔

ترجمہ۔ یعنی اے ہمارے رب ہدایت کے بعد ہمارے دلوں کو موڑ نہ دینا۔

اسی کا نام دوام ثبات اور استقامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کو جب ان کی قوم نے دھمکی دی تھی، تو آپ نے فرمایا۔ اَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِيْنَ اور قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا تو خود نبی جس کا تکفل عصمت ہے وہ بھی یہی فرما رہے ہیں، کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہمیں اس ملت باطلہ میں واپس لوٹایا جا سکتا ہے۔ مگر چونکہ اس کا وعدہ ہے اس لئے اس کی مشیت نہیں ہوگی۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھے یہ اشیاء ضرر نہیں پہنچا سکتیں اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرماتے ہیں۔ لَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ الآیۃ۔ کہ اگر ہم آپ کو توحید پہ قائم و ثابت نہ رکھتے تو قریب تھا کہ آپ ان کی طرف جھک جاتے۔

اسی واسطے ہر شخص، اداءت فقیر لی التسبب اور سب کو اس بات کا خوف ہے کہ ہدایت پانے کے بعد کہیں گمراہی کی طرف نہ لوٹ جائیں

۱۰۔ یہ سب چیزیں موجود ہوں۔ پھر اسی ہدایت میں ازدیاد ہو۔ کہ ہر وقت معرفت کی طرف بڑھتا ہے۔ اسی کو قرآن مجید میں بایں الفاظ فرمایا گیا۔ زَادَهُمْ هُدًى الآیۃ۔ کیونکہ معرفت الٰہیہ اور علوم الٰہیہ کی کوئی حد نہیں ہے

اے برادر بے نہایت درگہیست ۔۱۔
ہر چہ بروے میرسی بروے مایست

toobaa-elibrary.blogspot.com

بنابریں ہر رکعت میں اور ہر نماز میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی دعا مانگی جاتی ہے کہ اس سمت قسم کی ہدایات میں ترقی کرتا رہوں اور ہدایات میں ازدیاد ہو۔ بجب لسان، اللہ تعالے کا غلام ہو اور غلام کا کام ہے۔ کہ وہ اپنے آقا کے حکم پر کمربستہ رہے۔ اس لئے اهدنا الصراط الخ کہا گیا۔

اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ

یعنی سیدھا راستہ۔ لغت میں صراط کے معنی طریق وسبیل وغیرہ کے آتے ہیں مگر امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ صراط بہ صاد و باسین دونوں لغتیں ہیں۔ تو جہاں انہوں نے سرط کے معنی بیان کئے ہیں وہاں کہا ہے کہ سرط طریق مستسہل یعنی سہل طریق کو کہتے ہیں س۔ ر۔ ط کے معنی میں ستلاع یعنی نگل جانا۔ لقمہ کر لینا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ سرط الطعام۔ یعنی کھانا نگل گیا۔ تو صراط اس راستہ کو کہا جائے گا جس کو چلنے والا آسانی سے طے کرے۔ گویا کہ اس کو نگل لے۔ اس لئے باری تعالے نے صراط کو اکثر استعمال کیا ہے۔ ابن جریر نے لکھا ہے کہ تمام اہل لغت کا اتفاق ہے۔ کہ صراط سبیل واضح کو کہتے ہیں۔ تو یہ سہولت وصوح کے اعتبار سے ہوئی۔ پہلی سہولت تو باعتبار مسافت کے تھی چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ عطیت شریعۃ سہلۃ سمحۃ بیضاء۔ کیونکہ راستے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ کہ سہل تو ہے لیکن چلنے والا دیر سے پہنچتا ہے۔ مگر ایک راستہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ۔ جس میں ہیر پھیر ہوا کرتا ہے۔ اس لئے صراط کی صفت مستقیم لائی گئی۔ چنانچہ ریاضی والے کہتے ہیں کہ دو نقطوں کے درمیان جو خط مستقیم کھینچا جائے۔ وہ دوسری خطوط سے اقصر یعنی چھوٹا ہوتا ہے جس میں مسافت بڑھی ہوئی ہوا کرتی ہے۔ استقامت کبھی تو اعوجاج کی ضد آتی ہے۔ اور کبھی استقامت کے معنی اعتدال کے آتے ہیں۔ جیسا کہ قاموس وغیرہ نے لکھا ہے کہ۔ استقام بمعنی اعتدل تو معنے یہ ہوئے کہ وہ راستہ جو افراط اور تفریط سے خالی ہو۔ تو دو معنے ہوئے۔ اب رہا یہ ہے کہ منزل مقصود کیا ہے۔ اور راستہ کون سا مراد ہے۔ اس میں مختلف اقوال ہیں چونکہ قرآن مجید یفسر بعضہ بعضا یعنی بعض قرآن بعض کی تفسیر کرتا ہے۔

اور دین میں دو قسم کی چیزیں ہیں۔

مقاصد کلیہ اور اصول عقائد اور اعمال اور دوسرے ان کے فروع اور شعب ہیں۔ لیکن یہ بھی درجہ بدرجہ ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔ ایمان کے کچھ ستر سے اوپر شعبے ہیں۔ سو

toobaa-elibrary.blogspot.com

تو وہ ہیں۔ جو غیر متبدل ہوتے ہیں تو وہ معاملات کے قبیلہ سے ہوں یا عبادات کے قبیلہ سے وہ تو ایسے ہیں کہ ان پر سب کا ایمان ہے۔ جیسے توحید تقدیر۔ قیامت کا ماننا۔ جنت دوزخ وغیرہ ان جیسے عقائد پر سب کا اتفاق ہے۔ ہر نبی نے اس کی تلقین کی ہے۔ البتہ تفصیل بعد اجمال کا فرق ہے۔ وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ شَيْءٍ الآیۃ

الحاصل جب کسی مذہب میں شرک ہو۔ تو وہ دین سماوی نہیں ہو سکتا ایسے اخلاق یعنی جھوٹ نہ بولنا یہ سب اخلاق کی انبیاء علیہم السلام نے تعلیم دی ہے۔

اَلَّا تُشْرِكُوا بِاللّٰهِ شَيْئًا۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا۔ وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ آگے فرماتے ہیں۔ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى یہ سب اصول ہیں آگے فرماتے ہیں۔ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ۔ تو یہ صراط مستقیم ہوا۔ جو تمام عقائد و اعمال اور اخلاق میں مشترک تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ الآیۃ یہ فرقانات درجہ ہے پھر آگے فرماتے ہیں۔ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ۔ تو معلوم ہوا کہ یہ کتاب ایسی ہے کہ جس میں سب کے خلاصے اور لب لباب جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اور یہ کتاب دیگر کتب سے مستغنی کرنے والی ہے۔

تھیم کے نے اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے طب یونانی کے اصول ایک ہیں۔ مگر موسم۔ مزاج۔ آب و ہوا کے اختلاف سے طبیب ور نسخے تجویز کرتا ہے۔ ایسے ہی عالم میں مواسم بدلتے رہے۔ وہ ان کے موافق تھوڑی تھوڑی خبریں اور احکام آتے رہے۔ مگر ایک کتاب یہی ہے۔ جو کہ معتدل ہے۔ اس میں مواسم وغیرہ کا تغیر و تبدل ہے ہی نہیں۔ چنانچہ تورات میں آیا۔ کہ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ مگر انجیل میں کہا گیا۔ کہ اگر کوئی تمہارے ایک رخسار پر طمانچہ مارے۔ تو تم دوسرا گال بھی پیش کر دو۔ لیکن قرآن مجید نے ایسا اعتدال چاہا کیا ہے۔ کہ جس پر ہر ایک عمل کر سکتا ہے۔ فرمایا۔

جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ اس میں اختلاف مزاج وغیرہ کچھ نہیں۔ اس سے اگر صراط مستقیم سے قرآن مجید مراد لیا جائے تو صحیح ہو گا۔ چنانچہ فرمایا۔

وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ تو معلوم ہوا کہ صراط مستقیم پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ حکم ہو۔ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ۔ تیسری جگہ فرمایا۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ

toobaa-elibrary.blogspot.com

مَا وَصّٰی بِہٖ نُوحًا اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ

معلوم ہوا کہ دین ایک ہے۔ یہ بھی فرمایا۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ اِنَّ اُمَّتُکُمْ فِیْ ھٰذَا الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِیْمِ

تو ان سب آیات کریمہ سے ثابت ہوا کہ صراط مستقیم کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ وہ اصول وعقائد میں رہا اختلاف اور نسخ وہ فروع میں ہے۔

چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ صراط مستقیم سے قرآن مراد ہے۔ اور مسند امام احمد میں صراط مستقیم کی ایک مثال بیان کی گئی ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ صراط مستقیم ہی اسلام ہے۔ اسلام تو پہلے سے ہے۔ مگر ہمارے دین کو اسلام اس لئے کہا گیا ہے۔ گرچہ لغوی معنی کے اعتبار سے تمام ادیان میں مشترک ہیں۔ مگر یہ لقب کے طور پر اس دین کا نام پڑ گیا۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ قال الحافظ ابن حجر یا قال فی کتاب یعنی کتاب سیبویہ تو معلوم ہو کہ لقب کے طور پر اسلام ادیان کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ لقب کے طور پر اس ہمارے دین کے لئے منتقل کیا گیا ہے۔ تو صراط مستقیم کی تفسیر اسلام اور قرآن ہوئی۔ دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ قرآن بھی اسلام ہے۔ اور اسلام بھی قرآن کا نام ہے۔ تو صراط مستقیم میں تین چیزوں کی طلب ہوئی۔ سہولت۔ وضاحت اور قریب تر اور نزدیک تر راستہ ہو۔ جیسے راہگیر کو راہبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ویسا راستہ کے لئے رفاقت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ عقل اور خود واجب نے تعلیم دی ہے۔ کہ الوحدہ شیطان ﷺ حدیث اس کا مطلب یہ نہیں کہ اکیلا سفر کرنا ناجائز ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اکیلا ہونے میں بہت سے نقصانات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اس لئے کم از کم تین آدمیوں کا قافلہ سنت قرار دیا گیا ہے۔ سو سفر اختیار کرنے کے لئے رفیق ضروری ہے۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں۔ الجار ثم الدار و الرفیق ثم الطریق تو چونکہ رفیق کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی تکمیل کے لئے صراط الذین ﷺ انعمت بدل لائے یعنی رفقائے سفر ایسے ہوں کہ جن پر آپ نے انعامات کئے ہیں۔ یعنی جو اس راستے پر گزر رہے ہیں اور گزر رہے ہیں۔ تو اس سے وحشت نہ ہوگی۔ سورۃ نساء میں جہاں منافقین کا ذکر کیا ہے وہاں ایک قصہ کی طرف اشارہ ہے کہ ایک یہودی اور منافق میں باہم جھگڑا ہوا۔ اور انہوں نے فیصلہ کرانے کے لئے حکم بنانا چاہا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

تو منافق نے کعب بن اشرف تاجر کا نام تجویز کیا اور یہودی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ ہر ایک کو اس بات کا یقین تھا۔ کہ نبوی دربار میں رشوت۔ سفارش وغیرہ اور ناحق فیصلہ کرنے اور رعایت کرنے کا احتمال نہیں تھا۔ اس لئے یہودی نے آپ کا نام تجویز کیا۔ کیونکہ وہ حق پر تھا۔ چنانچہ آپ نے اسی کے حق میں فیصلہ دیا۔ منافق راضی نہ ہوا۔ بلکہ فیصلہ حضرت عمرؓ کے پاس لے گئے۔ کیونکہ آپ کے عہد میں بعض معاملات میں حضرت عمرؓ کو فیصلہ کا اختیار دیا گیا تھا۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا۔ امانت صرف مال کی مراد نہیں بلکہ امانت عام ہے۔ آگے فرماتے ہیں۔

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ۔ اگر رسول زندہ ہیں۔ تو ان کے سامنے لے جاؤ۔ اگر وہ اس دنیا سے اٹھ گئے۔ تو ان کی سنت کی طرف رجوع کیا جائے۔ آگے فرمایا گیا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ ... وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ يعني طاغوت۔ یعنی کعب بن اشرف وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ۔ یہ قاعدہ بیان فرماتے ہیں۔ وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا۔ تو ان احکام کو بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اب صراط مستقیم پر چل سکتا ہے۔ آگے فرمایا

مَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ۔ یعنی اس کو رفاقت نصیب ہے۔ اگرچہ وہ اکیلا ہے۔ مگر یہ نہ سمجھے کہ میں اکیلا ہوں۔ بلکہ ملائکہ وغیرہ اس کے ساتھ ہیں۔ منعم علیہم میں النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین کیونکہ انسان میں۔ ایک قوت علمیہ اور دوسری قوت عملیہ ہوا کرتی ہے۔ اگر دونوں قوتوں کی تکمیل ہو تو انسان کامل ہے۔ جس قدر کمی ہوگی انسان میں اتنا نقص ہوگا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ جو انعام فرماتے ہیں وہ بھی دو قسم کے ہوں گے۔ کہ جو علم صحیح اور عمل صالح کے ساتھ تعلق رکھیں گی۔ پھر ان میں مدارج ہیں۔ ایک تو یہ کہ کامل ہو۔ مگر مکمل نہ ہو۔ یعنی اپنے آپ سمجھ لیا۔ مگر دوسروں کو نہیں سمجھایا۔ اور ایک وہ کہ خود کامل اور دوسرے کے لئے مکمل۔ یعنی دونوں طرح کا ہو۔

اسی طرح قوت عملیہ کے بھی کئی مدارج ہیں۔ ایک تو وہ کہ نفس ان کے عمال کو دیکھ کر رغبت کرے۔ جیسے صحابہ کرامؓ کے اعمال، اور مولانا سید محمد مجدد بریلوی کے اعمال ایسے ہیں۔ کہ خود بھی عامل ہیں اور دوسروں کو بھی عمل کی طرف کھینچتے ہیں۔ اور دوسرا وہ کہ عامل تو ہے۔ یعنی صلاحیت عمل کی ہے۔ مگر کھینچتا جاتا ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اسی میں حیثیت اسے نبی بنی با بمعنی خبر سے مشتق ہے۔ تو نبی وہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ سے خبر حاصل کرے اور وہ دوسروں تک پہنچائے۔ تو خبر کا تعلق قوت علمیہ سے ہوا تو نبی وہ ہوا جس کی قوت علمیہ کامل ہو۔ اور وہ دوسروں کو بھی پہنچائے۔ اگرچہ اس میں قوت عمل بھی کمی ہو۔

اور صدیق وہ ہے کہ جس میں خبر کے جاننے کی صلاحیت ہو۔ یعنی قبول حق کے لئے اس کا قلب بغیر کسی دلیل کے کچھ۔ یہی صدیق ہوتا ہے۔ تو ہر نبی صدیق ہوگا۔ مگر ہر صدیق نبی نہیں ہوتا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا

کیونکہ نبی جو کچھ اللہ تعالیٰ سے لیتا ہے۔ اس میں اس کو کسی قسم کا تردد نہیں ہوتا ایسے عمل ہے یعنی اپنے جوارح کو عمل میں لگائے۔ وہ یا تو اپنی جان دے دے گا۔ یا بعض جوارح کام میں لگائے گا۔ اگر اپنی جان تک یعنی سب چیزوں سے منقطع یعنی تنگ ہو کر نکلے تو وہ شہید ہے۔ یعنی شہید اپنی قوت عملیہ کا انتہائی مظاہرہ کرتا ہے۔

صالح وہ ہے جو ہیں اس عمل کے قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔ مگر یہ دیگر نفوس کو برانگیختہ نہیں کرتا اس سے آگے فرمایا وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا کہ یہ بہترین ساتھی ہیں۔ مرزا قادیانی نے اس آیت کو لے کر کہا کہ نبوت کا سلسلہ جاری ہے کیونکہ دعا جب وہ کی قبول ہوتی ہے تو جب منعم علیہم کی تفسیر سورۃ نساء کی آیت سے معلوم ہوگئی تو جو نیکیوں کے راستہ پر چلے گا وہ نیک ہوگا۔ اور جو نبیوں کے راستہ پر چلے گا وہ نبی ہوگا۔ چنانچہ یہ واقعہ حضرت مولانا عثمانی کے پیش آیا تو آپ نے ان قادیانیوں کو جواب دیا کہ جو گدھے کے رستے پہ چلے گا وہ گدھا بن جائے گا۔ اور جو موٹر گاڑی کے راستہ پر چلے گا وہ موٹر گاڑی بن جائے گا۔ جو بادشاہ کے راستہ پر چلے وہ بادشاہ بن جائے گا۔ مگر یہ سب کچھ بطور ظرافت کے تھا۔

لیکن قرآن مجید میں ایک جگہ صراط مستقیم فرمایا گیا ہے۔ صِرَاطِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ فرمایا ہے۔ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ۔ تو اس وقت صراط مستقیم پر چلنے والا نعوذ باللہ خدا بن جائے گا پھر وہ کیسے نکلا۔ کہ خدا بننا تو ممتنع عقلی ہے مگر نبی بننا ممتنع نہیں ہے۔ تو جو ما کہا گیا کہ نبی بننا ممتنع شرعی ہے۔

اصل غلطی کا منشاء یہ ہے کہ نبوت کو کسبی چیز فرض کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ تو وہبی چیز ہے۔ تو صراط النبیین کا مطلب یہ ہوا کہ وہ راستہ جو انبیاء کرام لائے۔ اور وہ راستہ جو اللہ تعالیٰ نے دیا۔ اور وہ راستہ جس پر شہداء اور صالحین چلے۔ یہ نہیں کہ وہ پہلے آئے۔ اور راستہ بعد میں آیا چنانچہ حضرت مولانا عثمانی فرماتے ہیں کہ میں نے قادیانیوں سے کہا کہ تم میں سے جو علوم قرآنی کو زیادہ جاننے والا ہو۔ وہ ایک رکوع کی تفسیر

toobaa-elibrary.blogspot.com

کردے۔ اور میں بھی تفسیر کرتا ہوں۔ اسی پر فیصلہ ہو جائے گا۔ مگر وہ اس سے انکار کر گئے فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ۔ یہ تمنا کی قرآن دانی ہے۔

الحاصل نعمتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ روحانی اور اخروی۔ دوسرے دنیوی یعنی ایک وہ نعمتیں ہیں جن کا ثمرہ اور ذائقہ آخرت میں ظاہر ہوگا۔ اگرچہ دنیا میں بھی قلوب اور ارواح ان کا احساس کرتے ہیں۔ اور ایک وہ نعمتیں ہیں جن کا ترتب دنیا میں ہے۔

الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ " سے اخروی نعمتیں مرادہیں۔ مگر کہیں کہیں نعم دنیاوی پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے ایک قریہ کے متعلق فرمایا گیا قَرْيَةً آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ۔ ان انعم سے وہی امن و اطمینان کی زندگی مراد ہے۔ آگے فرمایا۔

فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ۔ جیسے لباس ساتر ہوتا ہے۔ ایسے عذاب الٰہی نے بھی ان کا احاطہ کر لیا تو چونکہ جوع اور خوف کو جزاء و بدل قرار دیا گیا ہے۔ جو امن اور اطمینان کی ضد ہیں تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ دنیاوی انعم پر بھی نعمت کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ تو نعمت سے جو انعام سمجھا جاتا ہے وہ انعام عام ہے۔ خواہ دنیوی ہو یا اخروی۔

الَّذِينَ أَنْعَمْتَ " سے مراد یہ ہوا کہ صراط سے سعادت دارین کی ہمیں ہدایت کیجئے۔ تو اخروی نعم تو یقیناً مراد ہیں۔ ایسے دنیوی بھی جیسے فرمایا، أَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ۔ یہ سب وعدے قوم کے لئے ہیں۔ افراد اور آحاد کے لئے نہیں ہیں۔ تو صراط سے کامیابی کا راستہ مراد ہوا۔ جیسے کسی دکاندار سے کہا جاتا ہے۔ کہ ہمارا ارادہ ایک دکان کھولنے کا ہے۔ تو ہمیں ایک راستہ بتاؤ جو کامیاب تاجر کا راستہ ہو۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اس راستہ پر چل کر ہمیں بھی کامیابی حاصل کر دوں۔ تو ایسے ہی صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں وہی انعامات مراد ہیں۔

علامہ مشرقی نے اس آیت کے تحت لکھا ہے۔ کہ زمین میں غلبہ ہو۔ اور جس کو غلبہ ہو وہی صراط مستقیم پر ہے اور وہی مومن ہے۔ ورنہ یہ تمکین فی الارض اور غلبہ اسے حاصل نہ ہوتا۔ تو نعوذ باللہ اس سے تو یہ لازم آئے گا۔ کہ فرعون صراط مستقیم پر تھا۔ اور بنی اسرائیل ضلالت پر تھے۔ اور فرعون کے دعاوی بھی اسی طرح کے تھے۔ غلطی کا منشاء یہ ہے۔ کہ جہاں جہاں مومنین کی بشارتیں دی گئی ہیں۔ تو اس سے سمجھ لیا گیا کہ ملازمت جانبین سے ہے۔ یعنی جو غالب ہوگا وہ مومن اور جو مومن ہوگا وہ غالب ہوگا۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔

بلکہ ملازمت یک جانب سے ہے۔ کہ جو قوم مؤمن ہوگی آخر اس کا غلبہ ہونا ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ جس کو غلبہ ہو وہ مؤمن ہے جیسے حرارت شمس کو لازم ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ جہاں حرارت پائی جائے وہاں شمس بھی ہو۔ حالانکہ نار میں حرارت پائی جاتی ہے۔ تو خلاصہ یہ ہوا کہ جو قوم اعمال صالحہ کرے تو اس کو تمکن فی الارض ہوگا یہ نہیں کہ جسے تمکن فی الارض حاصل ہے ان میں اعمال صالحہ بھی پائے جائیں۔

اور دوسری جگہ فرمایا: زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ، آخر میں فرمایا: ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ جس کے پاس دنیا آجائے اس کو مؤمن کا معیار قرار دیا جائے۔ یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو تو پھر غلبہ حاصل کرنا جائز نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس غلبہ حاصل کرنے سے تو ایک مؤمن کو مرتد بنانا ہے حالانکہ فرمایا گیا ہے۔

اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔

تو ایسی صریح چیز ہے جس کو انبیاء علیہم السلام بتاتے چلے آتے ہیں۔ کہ دنیا دین کا معیار ایمان نہیں ہے۔ اس لئے تو انبیاء علیہم السلام پر اعتراض کیا کرتے تھے۔ کہ ان کے پاس نہ اسباب معیشت ہے اور نہ سواری ہے تو ان سے معلوم ہوا کہ ان دونوں میں لزوم ایک طرف سے پایا جاتا ہے۔ اور بدل لانے کی ضرورت یہ ہے۔ کہ اس سے تنبیہ کرنا ہے کہ دنیا میں سب سے مؤثر چیز جو قلب پر وارد ہوتی ہے وہ واقعات اور شواہد ہیں۔ کیونکہ واقعات اور شواہد کی روشنی میں خوب جیسے کسی چیز کو قبول کرتے ہیں۔ اتنا دلائل کی روشنی میں اثر نہیں پایا جاتا۔ اس سے تاریخ کا جاننا ضروری معلوم ہوتا ہے چنانچہ قرآن مجید کے تین حصے قصص پر مشتمل ہیں۔ اور اس کی وجہ یہی ہے۔ تاکہ مسلمان ہمیشہ پہلے لوگوں کے واقعات پر غور کریں۔ کہ کن کن وجوہ سے کامیابی نصیب ہوئی اور کن وجوہ سے ان کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ تو گویا اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ نے ان قصص کا پتہ دے دیا۔ کہ تین قسم کے لوگ ہیں۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

منعم علیہم، مغضوب علیہم اور الضالین۔

صراط کا لفظ شریعت کی رہنمائی میں پل صراط پر بھی مستعمل ہوا ہے۔ جو پل میدانِ حشر میں جنت تک کے درمیان جہنم پر پڑا ہوا ہے۔ اس پر سے ہر ایک کو گزرنا ہوگا۔

وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا۔

اور یہ ضروری ہے۔ شاہ ولی اللہ مرحوم اور امام غزالیؒ اور امام شعرانیؒ وغیرہم نے یہ بتلایا ہے۔ کہ یہ صراطِ مستقیم یعنی دین و شریعت اس کو بعینہٖ متجسد و متشکل بنا کر اس جہاں پر ڈالا جائے گا۔ تو دنیا میں جو شخص جیسا اس پر چلتا ہوگا۔ ویسے ہی اس پل پر چلے گا۔

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ

بعض لوگ غیر کو صراط کا بدل قرار دیتے ہیں یعنی غیر صراط المغضوب علیہم۔ مگر یہ قول مرجوح ہے۔ محققین فرماتے ہیں کہ غیر الذین انعمت علیہم سے بدل واقع ہے۔ ترجمہ ہوگا۔ وہ لوگ جن پر آپ نے انعام فرمایا۔ وہ مغضوب علیہم کے غیر ہیں۔ گرچہ نحاۃ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ غیر اسم نکرات میں سے ہے۔ جو صفت کے بعد بھی معرفہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بعض نے کہا کہ یہ تو بدل ہے۔ وہ نہیں صفت ہے۔ مگر یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ بعض اوقات معرفہ بن جاتا ہے جب کہ لفظ غیر متضادین کے درمیان واقع ہو جیسے کہا جاتا ہے۔ علیک الحرکۃ غیر السکون تو اس سے لفظ غیر اضافۃ کی وجہ سے معرفت ہو جاتا ہے۔ تو محققین کے مطابق اب ترجمہ یوں ہوگا۔

کہ ان لوگوں کے راستہ پر جن پر آپ نے مہربانی فرمائی جن پر نہ تو غصہ و غضب زدہ یہ ترجمہ حضرت شیخ الہند کا ہے اور کسی نے یہ ترجمہ نہیں کیا حتیٰ کہ شاہ عبدالقادر مرحوم جو اہم مترجم ہیں۔ انہوں نے بھی یہ ترجمہ نہیں کیا۔ جب ایک صفت کسی کے لئے ثابت کی جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے مقابل کا اثبات نہیں ہے۔ جیسے اگر کہا جائے۔ کہ فلاں نیک ہے اس سے یہ لازم نہیں ہے۔ کہ اس کے مقابل کا اثبات نہیں۔ کہ وہ بدی کے ساتھ موصوف نہیں۔ حالانکہ بعض لوگ مخلوط الاعمال ہوا کرتے ہیں۔ کہ اپنے ایک عمل کی وجہ سے انعام کے قابل اور اپنے دوسرے عمل کی وجہ سے قابل سزا ہو کرتا ہے۔ اس لئے الذین انعمت علیہم پر اکتفا نہیں کیا گیا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

بلکہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ سے بدل لایا گیا۔ کیونکہ حرام سے غضب کی نفی نہیں ہو جاتی کیونکہ محتملاً لا محال میں دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ پورے مغضوب علیہم تو کفار ہیں۔ اور پورے منعم علیہم، انبیاء اولیاء اور صلحاء ہیں۔ تو ان کے درمیان ایک شق نکل سکتی ہے۔ وہ اختلاط کی ہے۔ اس لئے مغضوب علیہم کی نفی کر دی گئی۔ کہ ایسے منعم علیہم کا راستہ کہ جس میں بھٹکنے کا اندیشہ نہ ہو۔ اس بیروت کے عیسائی نے ھٰذَا الصِّرَاطُ الْاِیْمَانُ کہہ کر سورۃ فاتحہ کو ختم کر دیا ہے۔ جو خود صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں نہیں۔ ان کا اس میں پتہ بھی نہیں چلتا

ایمان کی مثال پرندے کی سی ہے۔ کہ جیسے پرندہ اپنے دو بازو سے اڑتا ہے اگر ان میں سے ایک نہ ہو۔ تو وہ اڑ نہیں سکتا۔ ایسے ایمان کے دو بازو ہیں۔ رجاء اور خوف۔ ایسے ہی اگر ان میں سے ایک بازو کٹ جائے۔ تو ایمان کا پرندہ بھی نہیں اڑ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے بشارت دی۔ وہاں وعیدات سے خوف بھی دلایا ہے

حضرت عمرؓ کے قول کو امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں نقل کیا ہے کہ اگر قیامت میں اللہ تعالیٰ یہ فرمائیں۔ کہ میں نے سب کو جنت میں ڈالا سوائے ایک کے۔ تو آپ فرماتے ہیں۔ کہ یقیناً مجھے یہ خوف ہوگا۔ کہ کہیں وہ ایک میں ہی نہ ہوں۔ ایسے اگر اللہ تعالیٰ یہ فرما دیں۔ کہ میں نے سب کو جہنم میں ڈالا مگر ایک کو۔ تو مجھے اتنا امید ہے کہ وہ میں ہی ہوں گا

یَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا الآیۃ

حضرت مولانا عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن یہ آیت پڑھی۔ تو یک دم مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ کہ بے اختیار رونے لگا۔ آگے چل نہیں سکتا تھا۔ تو قریباً تیس مرتبہ اس کو پڑھا لیکن آگے نظر پڑی۔ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ۔ تو ایسے معلوم ہوا کہ جیسے جلتی ہوئی آگ پر پانی کا گھڑا ڈال دیا جائے تو وہ ٹھنڈی ہو جائے اس لئے اللہ تعالیٰ نے نہ تو ناامیدی دلائی ہے۔ اور نہ ہی امید بلکہ بین بین فرمایا ہے علیہ حسب صفات دو قسم کی ہوتی ہیں جمالی اور جلالی یعنی تبشیر اور تخویف تو اگر فقط تبشیر ہو۔ یعنی اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ جس کو نسبت ہے الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ کہ جس میں صفت جمال کا پہلو ہے اس کے ساتھ تعلق ہے۔ مالک یَوْمِ الدِّیْنِ کا جس میں صفت جلال کا پہلو غالب ہے اس کا کوئی محل ہونا چاہیے۔ اس سے

toobaa-elibrary.blogspot.com

غیر المغضوب علیہم کا مفہوم ضروری معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں فرمایا گیا اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّہُمْ رَغَبًا وَّ رَہَبًا

تو چونکہ یہ سورۃ فاتحہ تمام قرآن مجید کا خلاصہ ہے۔ تو اس میں ان دونوں صفات کا ہونا ضروری تھا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص راستہ پر چلا جا رہا ہے۔ اس کے منزل مقصود تک نہ پہنچنے کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس راستہ پر چلا جا رہا ہے۔ اس کے متعلق پوچھ پڑے گا سمجھ لے کہ یہ میری منزل مقصود تک کا راستہ ہی ہے یا کوئی اور۔ اگر نہ پوچھا تو قصوروار ہوگا اسے اپنے پیسے کے ضائع ہونے کا خوف ہوگا۔ دوسرے یہ کہ علم سے جانتا ہے کہ منزل تک یہی راستہ جاتا ہے۔ پھر اس پر نہیں چلتا بلکہ کوئی اور راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ تو عدم علم کی وجہ سے یا بھول چوک کی وجہ سے محروم رہے گا۔ اور بھٹکتا پھرے گا۔ ایسے ہی بندے نے تو اللہ تعالیٰ سے راستہ طلب کیا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس راستہ کو تلاش نہ کریں۔ یا جان بوجھ کر اس پر کاربند نہ ہوں۔ آباؤ اجداد یا رسوم کی وجہ سے جیسے یہود وغیرہ نے کیا۔ اور نصاریٰ نے صراط مستقیم کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان پر ضلالت غالب ہے۔ اور یہود پر جحود و کتمان کے عنصر کا غلبہ ہے۔ اس سے یہود کے بارے میں غضب آمیز الفاظ فرمائے گئے۔ کیونکہ جانتے کے باوجود جحود اور کتمان کرتے ہیں۔ مَنْ لَّعَنَہُ اللّٰہُ وَغَضِبَ عَلَیْہِ اور نصاریٰ کے متعلق فرمایا گیا۔ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو کہ قابل ترجیح ہے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مغضوب علیہم کون ہیں۔ اور ضالین کون ہیں۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مغضوب علیہم سے یہود مراد ہیں۔ اور ضالین سے نصاریٰ مراد ہیں۔ بنابریں الذین انعمت علیہم سے یہود و نصاریٰ مراد نہیں ہو سکتے۔

تو بقول مفسرین منعم علیہم کا مصداق یہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انعام کی نسبت تو اللہ تعالیٰ کی ذات کی گئی ہے لیکن غضب کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں نہیں کی گئی حالانکہ خالق خیر و شر اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ بلکہ ہر فعل مشیت ایزدی سے ہوتا ہے۔ جیسے مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یُّضِلَّہٗ فرمایا گیا ہے۔ تو اس کی کیا وجہ ہے۔ حالانکہ مقابلہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

کے طور پر مَغضُوبِ عَلَیْھِمْ وَ مَسْئُولُھُمْ کہا جاتا۔ جواباً کہا جائے گا۔ کہ انعام تو بھی اور خیر چیز ہے۔ اس کی نسبت تو اپنی طرف کی ہے۔ مگر شر کی نسبت اپنی طرف نہیں کی گئی۔ اس کا جواب بعض مفسرین یہ دیتے ہیں کہ یہ مقام سوال اور طلب کا ہے۔ ایسے موقع پر مسئول عنہ کی طرف غضب اور ضلالت وغیرہ کی نسبت کرنا خلاف ادب ہے۔ اس لئے کہ یہ مقام استعطاف کا ہے۔ اور ایسے موقع پر غضب وغیرہ کی نسبت مناسب نہیں ہوتی۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ جب ہر غضب وغیرہ ہو چکا ہے۔ ان کا واسطہ نہ بتلایئے۔ یہ چیز قرآن مجید میں کثرت سے پائی جاتی ہے۔

وَلَا الضَّآلِّیْنَ

یہ لفظ لا نفی کا اگر نہ پایا جاتا تو بھی لفظ غیر کے تحت میں داخل ہو جاتا۔ مگر اس سے ایک خاص نکتے کی طرف اشارہ ہے۔ بہت سے مفسرین نے تو یہ کہہ دیا ہے۔ کہ لا زائدہ ہے جیسے مَا مَنَعَکَ اَنْ لَّا تَسْجُدَ میں لا زائدہ ہے لیکن کوئی ایسا حرف نہ ہو۔ اس کے معنی کا اضافہ کیا جائے۔ اس سے کوئی فائدہ نہ ہو عقل اس کو تسلیم نہیں کر سکتی سو اس میں یہ فائدہ ہے۔ کہ لا بڑھا کر اس بات پر متنبہ کرنا ہے۔ کہ غیر منعم علیہم دو نوع ہیں۔ کبھی تو وہ ارادہ اور قصد کی وجہ سے اور کبھی قصور نظر اور عدم علم کی وجہ سے غیر منعم علیہ ہوتے ہیں۔ جیسے کسی شخص کو کوئی مسئلہ معلوم نہیں۔ اور کوشش بھی نہیں۔ یعنی اس کے تلاش کی کوشش نہیں کرتا۔ یا معلوم تو ہے مگر کسی لالچ کی وجہ سے اس پر کاربند نہیں ہوتا۔ ایسے دونوں شخص منعم علیہم میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ منعم علیہ وہ ہے جس کو علم بھی ہو۔ ارادہ اور قصد میں بھی قصور نہ ہو۔ اسی کو حضرت عبد اللہ بن مبارک نے فرمایا

هَلْ اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْکُ
وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَّرُهْبَانُهَا

یعنی دین کو تین لوگوں نے برباد کیا۔ بے دین بادشاہوں نے بے عمل علماء نے اور جاہل صوفیوں نے۔ اگر یہاں لا زائدہ نہ ہوتا۔ تو یہ دو نوع الگ الگ معلوم نہ ہوتے۔ بلکہ مغضوب اور ضال دونوں کو ایک فرد قرار دیا جاتا۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ

toobaa-elibrary.blogspot.com

ولا تتبعوا اھواء قوم قد ضلوا ان دونوں وصفوں میں سے ہر ایک وصف ان میں ہے
ہر ایک پر تنبیہ ہے۔ تفاسیر میں مغضوب علیہم ولا الضالین بیان میں یہود و نصاریٰ اقوال ہیں اور
محدثین کے قول بھی ہیں۔ مگر اس پر اطمینان کرتا ہے کہ جب ایک حدیث مرفوع صحیح سامنے آ چکی۔ تو پھر
یہ قول کیسے؟ اور اصول بھی یہ ہے۔ کہ جو تفسیر خود حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیں۔ اس
کے علاوہ کوئی اور کیا اور بیان کرے گا۔ علامہ ابن تیمیہ نے بیان کیا ہے کہ ایک چیز جو کسی آیت کے
ذیل میں بتفصیل منقول ہو۔ اس سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ اس کا مصداق محض یہی ہے بلکہ بعض
اوقات، بمقاصد متعددہ میں سے ایک کو بیان کر دیا جاتا ہے۔ جیسے فاعل صاحب زمین میں رہ سہتا ہے اس
سے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ فاعل دنیا میں محض یہی ہے۔ بلکہ ایک ممتاز فرد بیان کرنا ہے۔ ایسے جہاں
آپ نے کسی لفظ کی تفسیر بیان کر دی۔ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بس کا فرد یہی ہے۔ بلکہ مقصود یہ
ہوتا ہے۔ کہ اس کا کامل اور ممتاز فرد یہ ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مرحوم نے بھی لکھا ہے کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مغضوب علیہم سے یہودی مراد ہیں۔ بلکہ اس
کا مطلب کلی ہوتا ہے یعنی یہ یہودیوں کے خصائل جن میں پائے جائیں اس لئے انہوں نے لکھا ہے کہ آج
کل کے علماء سوء یہود کے تابع ہیں۔ اتباع درسجادہ نشین نصاریٰ کے اشباہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہو
کہ جو صفت ان میں پائی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ مغضوب اور ضال بنے تھے۔ وہ صفات ان میں
ان میں پائے جاتے ہیں۔ اس سے حضرت مجدد الف ثانی جو صوفیائے کرام کے رکن رکین ہیں۔ فرماتے
ہیں کہ ایک شخص نے کسی بزرگ کا حوالہ دے کر کہا کہ وہ ایسے لکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہمیں
جا جنید و شبلی بکار نمی آید۔ ہمیں جا محمد بن حسن شیبانی و محمد بن ادریس شافعی کار مے آیند۔ تو جو
لوگ عدم علم کی وجہ سے یہ کام کر رہے ہیں۔ کہ وہ اپنے جیسے دکھاوے میں صحیح ہیں مگر شریعت کے
خلاف ہیں۔ تو وہ ضال ہیں۔ اور جو جاننے کے باوجود کتمان حق کرتے ہیں۔ وہ مغضوب علیہم ہیں۔ تو
مغضوب اور ضال کے علاوہ وہ شخص منعم علیہ ہو گا۔ کہ جس کا قصد و ارادہ بھی صادق ہو۔ تو اس سے
سیدھا مسلک طلب کرنا مقصود ہو۔ تو جب یہ ہماری درخواست پیش کرائی گئی۔ تو اس کا جواب
یہ دیا جاتا ہے۔ ھذا لعبدی ولعبدی ما سأل۔ یعنی یہ میرے بندے کے لئے ہے اور بندے
کو وہی کچھ ملے گا۔ جو اس نے مانگا۔ تو گویا اس کی منظوری ہو۔ قرآن مجید ہو۔ جس پر فرمایا گیا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔

کہ یہ قرآن مجید پوری ہدایت ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ

تو پورا قرآن مجید سورۃ فاتحہ کا جواب ہوا۔ بنا بریں سورۃ فاتحہ کو مصحف میں اوّل رکھا گیا اور سورۃ بقرہ کو بعد میں لایا گیا، تاکہ سوال و جواب کی تطبیق اور ترتیب ہو جائے کہ جو تم ہدی مانگتے ہو وہ یہ ہے۔ نیز ایک تیسری جماعت ہے جو حضرت شاہ صاحب مرحوم کے زمانہ میں نہیں پائی جاتی تھی۔ آج کل وہ جماعت موجود ہے۔ جس میں مغضوبیت اور ضلالت دونوں صفتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ آج کل کے جاہل لیڈر ہیں۔

؎ خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں۔

تفسیر سورۃ فاتحہ ختم شد
نَحْمَدُ اللّٰهَ عَلٰى ذٰلِكَ۔

مُحَمَّدُ عَبْدُ الْقَادِرِ رَقَمَہٗ
جامع تقریر و ناقل
۵ ۔ ۱۹۹۵ بروز جمعرات

toobaa-elibrary.blogspot.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُورَۃُ البَقَرَۃ

یہ سورۃ سب سور قرآنیہ سے طویل ہے اور احکام کے لئے اشمل ہے۔ یہاں تک کہ پانچ سو احکام کا
اسی سورۃ سے استنباط ہوتا ہے۔ یہ بعض ہدایات کا قول ہے۔ لیکن اس میں وسعت ہے۔ کہ اور احکام بھی
نکل سکتے ہیں۔ اس سورۃ کو فسطاط القرآن اور سنام القرآن بھی کہا گیا ہے۔ یعنی قرآن کا خیمہ اور قرآن کی کوہان
یعنی اونچی اور بلند اور سورۃ البقرہ ... کو ... بھی کہتے ہیں۔ یعنی چونکہ ... یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ
بن عمرؓ نے اسے آٹھ سال میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا۔ اور اختتام کے وقت بطور شکر اونٹنی
کو ذبح کیا۔ سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ یہ دونوں قیامت کے دن اپنے
قاری کے اوپر اس طرح سے آئیں گی جیسے ابر چھا جاتا ہے۔ اس لئے اسے فسطاط القرآن کہا گیا۔ آجکل
کے درس و تدریس ... یہ ایک اصول کے نکالا گیا ہے کہ سورۃ کا ایک موضوع ہونا چاہیئے۔ خواہ
وہ اصول و مبادی ہوں یا معاملات ہوں یا ... ہوں۔ ... اس ... ذکر کرتے ہیں یہ تمام عقائد
... جاتی ہے ... کا اہتمام کرتے ہیں ... اس کی
سلف صالحین سے کوئی مستند نہیں ملتی ... صحابہ کرام سے زیادہ کوئی مفسر نہیں ہو سکتا۔ وہ کہیں کوئی ایک
جملہ بیان کر دیتے ہیں بلکہ بعد کے علماء یعنی متاخرین میں سے بھی کسی نے یہ التزام نہیں کیا۔ امام شاطبیؒ جن کو مجتہد
کا درجہ حاصل ہے۔ ان کی کتاب موافقات ہے۔ جس کی غرض یہ تھی کہ ابن قاسمؒ جو امام مالکؒ کے شاگرد ہیں۔
ان کے اصول اور امام ابو حنیفہؒ کے اصول میں توافق تلاش کرتے ہیں۔ بہت سارے مسائل پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک
بحث لکھی ہے جس میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہر سورۃ کے لئے ایک محور اور مدار ہونا چاہیئے۔ اور بعض بعض
سورتوں کا موضوع بھی بیان کیا ہے۔ لیکن اور کسی کے کلام سے یہ طریق نہیں سمجھا جاتا۔
اگر سورۃ بقرہ کے لئے بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔ شاہ عبدالعزیز مرحوم اسی کا قلب آیۃ الکرسی کو

toobaa-elibrary.blogspot.com

قرار دیتے ہیں۔ درس کا قلب حی القیوم ہے۔ یہ دو صفتیں ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اس سورۃ کے تمام مضامین انہیں دو اسماء یعنی حی و قیوم کی شئون پر یہ سورۃ مشتمل ہے۔ اس کو انہوں نے تفصیل بیان کیا ہے

الٓمٓ

ان تین حروف تہجی سے اس سورۃ کا افتتاح کیا گیا۔ ان حروف تہجی میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ کلمات کا مادہ ہیں ان کی ترکیب سے کلمات بنتے ہیں۔ ان کے لئے کوئی معنی نہیں۔ اکثر علماء اسی کو کہتے ہیں۔ مستقلاً چند حروف ہیں لیکن بعض محققین مشیخ اکبر جیسے، لدین تو یہ شیخ عبد العزیز دباغ جیسے اولیائے کرام فرماتے ہیں کہ ان حروف میں سے ہر ایک کے لئے کوئی معنی ہیں اور ان کی تاثیر اور خواص ہیں۔ شیخ اکبر نے فتوحات مکیہ میں اس کو لکھا ہے کہ یہ حروف ایک مستقل عالم ہے۔ اور اسی طرح بعض حضرات رطب و یابس ان میں حیا۔ اور اولیاء بھی ہیں اور جو کلمہ جن حروف سے مرکب ہوتا ہے ان حروف کے معانی کا اثر اس مرکب میں باقی رہتا ہے لیکن یہ ہمارے خیالات سے بالاتر ہے۔ البتہ اتنا ہے کہ ان کی تاثیرات ہیں خود حدیث میں آتا ہے بشرط قرینہ تحقق قصققاً کا کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن تم ان کے ہاں ان حروف کے جمع ہونے سے اثر ظاہر ہوتا ہے

حضرت مولانا عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مجھے تجربہ ہے کہ ان حروف کی تاثیر سے سانپ کے کاٹے ہوئے کا علاج ہو جاتا ہے۔ البتہ ان کا کوئی معنی نہیں ہے۔ یہ چیز تو اتر کے درجہ ہوئی ہے۔ شیخ اکبر اس کو سرار الٰہیہ پر محمول کرتے ہیں۔ حضرت مولانا نانوتویؒ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں شیخ عبد العزیز دباغ امی ہیں اور لوگ ان کو بڑا سمجھتے ہیں جبکہ سادہ قرآن مجید بھی پڑھے ہوئے نہیں تھے۔ سالک بن احمد جو ان کے معتقد ہیں انہوں نے ان کے ملفوظات جمع کئے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ میں ان کے پاس اس لئے جاتا تھا کہ جس قدر عالم سے عالم شریعت کا مسئلہ ہوتا تھا۔ وہ بتا دیتے تھے ابریز فی ملفوظ شیخ عبد العزیز ان کی کتاب کا نام ہے۔ حروف مقطعات کے متعلق بھی ان سے سوال کیا گیا تو انہوں نے اس کا تفصیل سے جواب دیا۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ پہلے جواب دے دیتے تھے جس پر ہم بر سوں بعد میں پہنچتے تھے۔ آخر میں ان علامہ مبارکؒ نے درس بھی چھوڑ دیا تھا۔ مسلم در ملا حسن میں ان حروف کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ بعض حروف کا انکار کرتے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا جو انکار کرتے ہیں وہ بڑے

toobaa-elibrary.blogspot.com

محقق ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حرف کے تنگ معنی میں یعنی ضیغم غضنفر شیر کو، اور وجہ سے کہا جاتا ہے جیسے یک چیز کو موضوع ہر معنی مدلول، اور مفہوم ان میں ترادف نہیں مانا جاتا۔ ملکہ اجامیں تعاون ہے جیسے ضیغم، اسد، غضنفر کے بھی الگ الگ معنی ہیں۔

الغرض حضور ﷺ اسنادو تیح سورے کے متعلق کہا جائے گا کہ وقتی ان کے ثمرات ہیں۔ جن کو ارباب حقائق جانتے ہیں اور کہا یعنی یہ کہ شیخ سے منقول ہے۔ کہ یہ حروف مقطعات ایک علم مستور ہے۔ وہ متکلم اور مخاطب کے درمیان ایک راز ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے جو خواص ہیں۔ وہ اگر اس کو سمجھ لیں تو ممکن ہے مگر عوام اس کو نہیں جانتے جیسے آج کل یورپ کے لوگوں کے مختلف نام یا اصطلاحات اور القاب ہیں سی۔ آئی۔ پی۔ ایم۔ ڈبلیو۔ یو وغیرہ۔ اس سے مقصد ایک بڑے مضمون کو مختصر حروف میں بیان کرنا ہوتا ہے۔ تو ایسے ہی یہ حروف مقطعات کے ذریعہ ایک بڑے مقصد کو بیان کرنا ہے۔ لیکن اس پر شبہ ہوگا کہ قرآن مجید کو ھدی للناس کہا گیا ہے۔ تو وہ جز قرآن جو مستور ہے۔ تو وہ ھدی کیسے بنے گا۔ لیکن اگر خود کتاب واللہ بیان کردے کہ ان میں بعض حصہ مستور ہے۔ جیسے فرمایا۔

مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۔ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ

تو معلوم ہو کہ خاص حصہ مستور ہے۔ ھدی للناس کے یہ معنی نہیں کہ اس کا ہر ہر حرف ھدی ہے۔ بلکہ ہر شخص کی استعداد کے مطابق ہدایت بنتا ہے جیسے یہ عوام کے لئے ھدی ہے ایسے خواص کے لئے اور خواص خواص کے لئے بھی بدرجہ ہدایت بنتا ہے کیا جن حقائق کو ارباب حقائق سمجھ سکتے ہیں وہ ہم جان سکتے ہیں تو وہ تو جو نقل کئے ہیں کہ بعض اس کو قسم و بعض اسماء سور وغیرہ کہتے ہیں۔ اصل مقصد یہ نہیں کہ محض نام کے ہی معانی ہیں بلکہ یہ تو صرف اشارات ہیں۔ مولانا رومی فرماتے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

تعجب ہے ان روشن خیالوں پر جو کہتے ہیں کہ ان حروف کے نازل کرنے کا مقصد کیا ہو۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ آج کل جو آثار قدیمہ کو معلوم کرنے کے لئے نوکر و خادم مقرر کیے گئے ہیں۔ وہ اپنے خیال در سمجھ کے مطابق ان کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو اگر ہر آثار قدیمہ سے پوچھا جائے کہ آیا یہ کتبے لکھے ہوئے

toobaa-elibrary.blogspot.com

بے کار ہیں۔ تو وہ یہ کہے گا کہ نہیں بلکہ یہ ماقبل کا کلمہ ہو سکتا ہے۔ مقصد یہ کہ اگر کوئی مقصد ہوگا تو ایسے ہی ان حروف مقطعات میں معانی قیاس کر لیے جاتے۔ انتیس سورتیں ہیں کہ جن میں حروف مقطعات آئے ہیں۔ کہیں تو تکرار ہے، کہیں زیادتی ہے۔ اگر مکررات کو حذف کر دیا جائے تو کل چودہ حروف رہ جاتے ہیں جو بقول حضرت علیؓ سرمن اسرار اللہ ہیں۔

ذٰلِكَ الْكِتَابُ

اکثر مفسرین اور علما نے ذلک الکتاب کو مبتدا اور لاریب کو خبر قرار دیا ہے۔ لیکن ابوحیان نے کہا ہے کہ میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ ذلک مبتدا اور الکتاب اس کی خبر ہے۔ اور لاریب فیہ ایک مستقل جملہ ہے۔ حضرت مولانا عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک بھی ابن ابوحیانؒ کا مذہب راجح معلوم ہوتا ہے۔ ترجمہ ہوگا۔ یہ وہی کتاب ہے۔

ذلک اسم اشارہ ہے جمہور کے نزدیک ھذا اسم اشارہ قریب کے لیے اور ذلک بعید کے لیے ہوتا ہے جیسے یہ اور وہ اردو میں کہا جاتا ہے تو ذلک غائب اور بعید کے لیے ہوگا۔ اس صورت میں ذلک کا مشار الیہ بھی قرآن مجید ہوگا۔ جس کا ایک حصہ مکہ معظمہ میں نازل ہو چکا تھا کیونکہ یہ سورہ مدنیہ ہے۔ تو اس مجموعہ یا بعض حصہ کو مشار الیہ کہا جائے گا لیکن پھر شبہ ہوگا کہ حق تعالیٰ کے نزدیک تمام چیزوں کی نسبت علی السویہ ہے۔ قرب و بعد کا امکان ہی نہیں پھر ذلک کا کیا فائدہ۔ اکثر مفسرین یہ کہتے ہیں۔ کہ قرب و بعد باری تعالیٰ کے اعتبار سے نہیں، بلکہ محاورات اور مخلوقات کے اعتبار سے ہے۔ نیز یہاں قرب و بعد مکانی تو ہو نہیں سکتا۔ البتہ بعد رتبی اعتبار کیا جائے گا۔ کہ قرآن مجید اس حیثیت کے مطابق حاضر ہے تو قریب ہے لیکن اس میں جو علوم حقائق بشارت فصاحت و بلاغت وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ وہ فہم کے اذہان سے بعید ہیں۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ لوگوں کی رسائی ان حقائق تک نہیں ہو سکتی۔ قرآن مجید تو صفت ہے۔ اور اس کا مصدر باری تعالیٰ ہے۔ اور موصوف مخلوق ہے۔ تفہیماً اس کی مثال ایسے ہے جیسے آفتاب کا جرم وہ تو کروڑوں میل ہم سے دور ہے۔ اس کی شعاعیں ہم تک پہنچتی ہیں جو ذات آفتاب کے ساتھ قائم ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ اس سے جدا ہو کر تعلق پکڑیں۔ تو منبع نور کا آفتاب ہوا جو اس کے ساتھ قائم رہ کر مخلوقات سے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ ایسے ہی کلام حضرت باری تعالیٰ کی ذات

toobaa-elibrary.blogspot.com

کے ساتھ قائم ہے۔ جو کہ منبع اور مخزن ہے۔ یہ کلام اس کے ساتھ ہمیشہ سے قائم ہے۔ البتہ اس کی کلام کی روشنی نبی کے ساتھ آکر تعلق پکڑتی ہے۔ لیکن جیسے آفتاب کی روشنی اور شعاع کا ایک سرا جرم آفتاب سے قائم اور دائم رہتا ہے لیکن اس کی روشنی جو مخلوق سے تعلق رکھتی ہے وہ اس سے مفارق ہو سکتی ہے۔ تو اس معنی کے اعتبار سے کہ آفتاب سے متعلق ہے قریب ہے۔ اور اس اعتبار سے کہ وہ مخلوق سے تعلق رکھتی ہے بعید ہے یہی وجہ ہے کہ آج کل کے سائنسدانوں نے کہا ہے کہ آفتاب کی روشنی زمین پر آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اس میں حرکت ہے اور مسافت ہے۔ تو یہ کلام اللہ جو کہ ایک صفت ہے۔ جو باری تعالیٰ کے ساتھ قائم اور دائم ہے۔ اس اعتبار سے قریب ہے۔ اور اس اعتبار سے کہ اس کا تعلق مخلوق سے ہے اس تعلق کے اعتبار سے بعید ہے۔

یہ جو کہیں فرمایا گیا ذٰلک الکتاب اور کہیں فرمایا گیا ھٰذا کتاب۔ تو دونوں میں مشابہت موجود ہے اس جگہ تو ... اس پر کی طرف ہے پھر جب پہنچ جائے تو اس میں بعد ہے۔ اس میں اب کوئی شبہ باقی نہ رہا۔

الکتاب وہ جو وہاں سے نازل ہو کر پہنچ چکی ہے وہ کتاب ہے اب شبہ یہ ہے کہ پھر اسے الکتاب کہنا کیسے صحیح ہوگا اس کی مثال یہ ہے کہ جتنی نحو کی کتب تم نے دیکھی ہیں جیسے نحو کافیہ وغیرہ مگر جب وہ سیبویہ کی کتاب کو دیکھے اور اس سے حظ حاصل کرے۔ تو بے اختیار کہتا ہے کہ کتاب تو یہ ہے اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ جتنی کتابیں پہلے گزری ہیں وہ کتاب کہلانے کے قابل نہیں ہیں بلکہ کتاب ہے تو یہ ہے جیسے چراغ کی روشنی آفتاب کی روشنی کے مقابل میں ماند پڑ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اصلی روشنی تو آفتاب کی ہے۔ یعنی گویا کہ وہ سب اس کے مقابل میں ہیچ ہیں۔ کیونکہ اس نے تاریکی اور باقی روشنیوں کو ختم کر دیا۔ تو اب ذٰلک کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ جو مسلمانوں کے ہاتھ میں کتاب دی جا رہی ہے یہی کتاب ہے اس کے مقابل میں وہ سب کتابیں پیٹھنے کے قابل ہیں۔ کیونکہ جتنی ضروریات اور جتنے مضامین اور علوم ہیں۔ یہ سب پر مشتمل ہے اب کسی دوسری کتاب کی ضرورت ہے اور نہ دینا ہی کی۔ تو الکتاب پر الف و لام حقیقت کا ہوگا۔ کہ یہ حقیقی اور قابل کتاب ہے۔

درحقیقت یہ ہے کہ اسے کتاب کہا جائے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

لَارَیْبَ فِیْہِ

جملہ مستانفہ اس کی دلیل ہے، کہ یہ کتاب ایسی کامل ہے۔ کہ اس میں شک اور ریب کی کوئی گنجائش نہیں۔ تو جب تک کہ یہ الگ الگ جملہ کہا جائے گا۔ تو کلام میں عطف در پیدا ہو جائے گا۔ اور دونوں میں تعلق کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ پہلے انبیاء علیہم السلام نے اور ان کی کتب میں اس کتاب اور نبی خاتم النبیین کی بشارتیں لکھی ہوئی ہیں۔ کیونکہ آج کل کی تورات میں لکھا ہوا ہے کہ تیرے ان بھائیوں میں ایک نبی بھیجوں گا کہ جس کے منہ میں میں اپنا کلام ڈالوں گا۔ یہودیوں نے بڑی کوشش کی کہ اس کو خاتم النبیین ﷺ پر منطبق ہونے دیں مگر اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ تیرے بھائیوں سے نہیں بلکہ تمہارے بھائیوں میں سے یعنی ایک تو اسرائیلی اولاد ہے اور ایک بنی اسماعیل ہیں۔ اور یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام کے بھائی ہیں جو کہ یعقوب یعنی اسرائیل کے باپ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیرے بھائیوں میں معظم نبی بھیجوں گا اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔ تو ذلک سے اشارہ ہوا کہ جس کا وعدہ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اور پہلے بھی اس کا ذکر ہوتا آیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو جس کی خبر دی وہ یہی کتاب ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ

یہ دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام مانگ رہے ہیں کہ ان دونوں کی اولاد میں سے ایک نبی بھیج کہ جس کی امت امت مسلمہ کہلائے۔ اور تیری کتاب کی تعلیم دے۔ وہ کتاب یہی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ پہلے والی قوموں کو بتلاتے تھے اور ذکر کرتے آتے تھے۔ اس کا وعدہ ہے پورا ہو گیا۔ اس لئے مناسب ہے کہ ابو حیان کے قول کو ترجیح قرار دیا جائے تاکہ یہ مناسبت باقی رہے

لاریب فیہ عموماً اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔ ریب کے معنی اور شک میں عامہ اہل لغت کے نزدیک ترادف ہے لیکن بعض محققین جیسے امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ ریب، شک اور مریۃ ان تینوں میں فرق ہے۔ شک کے معنی یہ ہیں کہ دو متضاد چیزوں کے درمیان ٹھہر جانا۔ اس طرح کہ کسی جانب کو ترجیح نہ ہو اور کسی قرینہ کی طلب بھی نہ ہو جس سے کسی جانب کو ترجیح دے دی جائے۔ جیسے اس راستہ پر چلوں یا نہ چلوں اور قرینہ کی طلب بھی نہ ہو لیکن اگر توقف ہے اور ساتھ ہی قرینہ کی طلب ہو۔ تو اسے مریۃ کہتے ہیں۔ اور ریب کہتے ہیں کہ کسی چیز میں توہمات آتے ہوں

toobaa-elibrary.blogspot.com

جو اس چیز کو قبول کرنے سے روکتے ہیں لیکن اگر غور کریں تو وہ توہمات بھی زائل ہو جاتے ہیں اور اس چیز کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ البتہ جب تک کھٹکا رہے اور قدم آگے بڑھانے سے جو توقف رہے اسے کہا جاتا ہے اور یہ تو شک ہو سکتا ہے لیکن شک ریب نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ریب میں دونوں جانب کا مساوی ہونا ضروری نہیں۔ البتہ شک میں دونوں جانب کی مساوی ہونا ضروری ہے۔ تو اب توجیہ یہ ہوگا کہ جس چیز میں کچھ کھٹکا نہیں۔ ظن ہو یقین ہو ایسا کتاب کا ... اس کو بھی ریب کہتے ہیں

لا ریب فیہ بلکہ جملہ خبریہ ہے جس میں یہ خبر ہے کہ اس میں کوئی کھٹکا نہیں۔ لیکن ہم پہلے مشاہدہ کی کیسے تکذیب کریں کہ کروڑہا کروڑ انسان اس پر رہے ہیں، اس کو جھٹلاتے رہے اور شک کرنے والے تو اس سے بھی زیادہ ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جملہ خبریہ اگرچہ صورۃ ہے مگر معنی انشاء کے ہے۔ جیسے قرات "و لا فسوق" میں نفی معنی نہی کے ہے یعنی منع کرنا مقصود ہے ایسے ہی یہاں ہوگا۔ تو حاصل یہ ہوا کہ ریب نہ کرو۔ تو اب کوئی جھگڑا باقی نہیں رہے گا کیونکہ اس صورت میں صدق و کذب کا احتمال ہی نہیں لیکن اس تاویل کو ذوق سلیم تسلیم نہیں کر سکتا کیونکہ آگے سب جملے خبریہ ہیں۔ اس لئے بعض حضرات نے کہا کہ ریب سے مراد موضع ریب یعنی شک کرنے کی جگہ نہیں۔ اگر کوئی کرتا ہے تو اس کی شقاوت و کج فہمی ہے۔ جیسے ایک شخص کو صفرا ہو گیا ہے اس کا ذائقہ تلخ ہے اس کو جب شہد میٹھی اشیاء دی جاتی ہیں وہ انہیں کڑوا بتلاتا ہے وہ کڑواہٹ یقینی بات ہے کہ واقع کے مطابق اس کھانے میں نہیں بلکہ وہ کڑواہٹ چونکہ اس کے منہ میں ہے۔ اس لئے وہ ہر چیز میں کڑواہٹ محسوس کر رہا ہے۔ تو اگر وہ کہے کہ کھانا کڑوا ہے تو یہ واقع کے مطابق کڑوا نہیں بلکہ اس کو کڑوا محسوس ہو رہا ہے نہ کہ واقعتاً ایسا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عیب یا معصوم و محفوظ دعوے کے طور پر پیش کیا جائے۔ تو اس کو مطلب قبول نہیں کرتا۔ اور کبھی دجل و تلبیس تو نہیں ہوتی مگر عقیدہ ہوتا ہے جس میں کھٹکا اور شبہ ہوتا ہے۔ اور کبھی دونوں چیزیں نہیں مگر دعاوی ہیں جو کہ ایک دوسرے سے متناقض ہیں۔ جیسے مرزا قادیانی آنجہانی کے قول متناقضہ ہیں۔ ان تینوں صورتوں میں شک کو شک کرنے کا حق حاصل ہے۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ دعاوی بلا برہان کے ہوں لیکن اگر کوئی ایسا مضمون کہ جس میں یہ تمام شقیں نہیں پائی جاتیں۔ بلکہ وہ عقل کی روشنی میں مستحکم دعاوی بھی نہیں۔ تقلید بھی نہیں۔ مگر وہ اپنے آباؤ اجداد کے رسوم کی متابعت میں یا جاہ و مال کے برقرار رکھنے کے لئے شکوک و شبہات

toobaa-elibrary.blogspot.com

پیدا کرے۔ تو وہ شبہات اس کے قلب میں ہیں۔ قرآن میں نہیں۔ جیسے فرمایا گیا۔ لاریب فیہ۔
دوسری جگہ فرمایا گیا۔ بَلِ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ
اس جگہ ریب ان کے قلوب کے لیے ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن جس چیز میں وہ شبہ نکالتے ہیں
اس میں کوئی شبہ نہیں۔ یا جیسے بھینگے آدمی کو اکثر چیزیں ٹیڑھی اور بعض دو دو نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے
کہ اس کی طبیعت خراب ہے یا جیسے آئینہ میں مختلف شکلیں ایک آدمی کی نظر آتی ہیں۔ یہ قصور اس طرح دو
آئینہ میں نہیں بلکہ دیکھنے والے میں ہے

الحاصل لاریب فیہ میں کسی مجاز کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کتاب میں کوئی شبہ نہیں۔
بلکہ اس کی آیات بینات ایسی ہیں کہ کوئی ایسے دعوے ہی نہیں کر سکتے ہیں جیسا ہوں۔ چنانچہ فرمایا گیا۔
اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا یعنی اگر تمہارے دماغوں میں کوئی ریب ہے تو اپنے دماغوں
کی اصلاح کرو ورنہ اس کے مقابل کوئی ایک سورت یا ایک آیت لے آؤ

حضرت شیخ الہند مرحوم و مغفور نے لکھا ہے کہ محل ریب کتاب نہیں بلکہ تمہارا فہم محل ریب ہے
جو بعض نے لکھا ہے کہ ریب کی نفی ہے ریب کی نفی نہیں۔ یہ حیثیت تو متکلموں سے پایا یعنی زمخشری
وغیرہ نے اور جرجانی نے پایا۔ مستند تو معتزلہ امام مسلم ہے جرجانی بھی رد لکھی ہے۔ لیکن جو جو معنی
سے جو چھپے رہ گئے ہیں۔ معتزلہ کے دور سے یہ تھا کہ ان سے یہ لکھا ہے کہ ایک تو ریب ہے۔ اور ایک ریب میں
پڑتا ہے۔ یہ ریب فعل تو ہے۔ مگر ریب کی نفی ہے۔ نے اس نے لکھا ہے۔ کہ لاریب فیہ میں
ریب کی نفی کر دی گئی ہے۔ اس کا محل کتاب ہے اور جہاں ثابت کیا ہے۔ کہ جہاں ریب ہے وہاں دماغ
کو محل ریب کا محل قرار دیا ہے۔ جیسے، ان كنتم في ريب ورنہ مادہ کی بات ہے۔ کہ جو
شخص ایسے مکان میں ہو جس کو رنگدار شیشوں نے گھیر رکھا ہو۔ اس کے اندر ایک تمام اشیاء اسی رنگ پکڑتی
ہیں حالانکہ وہ اشیاء اسی رنگ کی نہیں ہیں۔ تو مطلب یہ ہوا کہ ان کو ریب نے گھیر رکھا ہے۔ وہ اس کی وجہ
یہ ہے کہ غور نہیں کرتا۔ یا سوئے فہم کی وجہ سے یا تقلید کی وجہ سے یہ تقلید بھی ایک پردہ ہے جیسی کہا گئے
ہیں یا تعصب و عناد کی وجہ سے ریب میں پڑ جاتے ہیں۔ تو مناسب یہ ہے۔ کہ لاریب کو اپنے حقیقی پر رکھا
جائے ایسے دعوے میں ریب پایا جاتا ہے۔ تو لاریب فیہ مجموعہ مستلزم ہوگا۔ جو قول کی تتمیم کرے گا کیونکہ
اس پر شبہ ہوتا تھا کہ دیگر کتب بھی تو ہیں۔ تو کہا گیا کہ اس میں کسی جانب سے بھی ریب نہیں ہے۔ ہر چیز کے

toobaa-elibrary.blogspot.com

اعتبار سے۔ پھر اس پر شبہ ہو۔ کہ شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ہم اس کو کیسے مانیں۔ جیسے معتزلہ حکیم وغیرہ سے کہ باز رہیں۔ ان کی اوصاف بیان کرتے ہیں۔ لیکن ان کے دعاوی کو بغیر براہین کے نہیں مانا جاتا۔ تو یہ بھی اس دعوی کے ثبوت کے لئے ھدی للمتقین فرمایا گیا۔

ھُدًی

ھدی مصدر ہے یا قائم مقام مصدر یعنی عوض یا مصدر ہے اسی قسم کے۔ مصادر بہت قلیل ہیں۔ جیسے تُقٰی، سُریٰ۔ بکی۔ مقصر مصدر کا حمل کتاب پر ہے۔ کیونکہ یہ خبر ہے۔ اور کتاب مبتدا۔ مقصد مانا جائے گا۔ تو مصدر بمعنی ھادی یا مبالغہ پر حمل کیا جائے۔ یعنی یہ عین رہنمائی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں پیکر خلاق ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مبالغہ پر محمول کیا جائے۔ تو معنی یوں ہوں گے۔ کہ یہ کتاب پیکر ہدایت ہے۔

ہدایت کے دو معنی ہیں۔ الدلالة علی ما یوصل الی المطلوب و رہنمائی (۲) ہدایۃ موصلۃ الی المطلوب۔ وہ رہنمائی جو سالک کو مطلوب تک پہنچا دے۔ یہ ہدایت کا لفظ اہل السنت والجماعت کے نزدیک ان دونوں معنی میں مشترک ہے۔ بعض اشاعرہ کے نزدیک کیونکہ کبھی تو لفظ کا اطلاق معنی پر من حیث انہ فعل اور کبھی من حیث انہ منفعل کے ہوتا ہے۔ تو ایسے ہی ہدایت میں یہ دونوں احتمال ہیں۔ پہلے معنی بتلانا۔ یہ تو مصدر من الفاعل ہے۔ اور دوسرے معنی یعنی جیسے بتلایا گیا ویسے اس پر عمل بھی کیا۔ تو یہ قبول اور منفعل ہو۔ تو جس نے پہلے معنی لئے تو اس نے محض فاعل کے مصدر کا اعتبار کیا۔ اور جس نے دوسرے معنی لئے تو اس نے انفعال کا بھی اعتبار کیا۔ اس لئے اس کا مطاوع اهتدی آتا ہے۔ جیسے انذر بمعنی کسی چیز کے عواقب سے ڈرانا۔ اس لئے کہ ایک تو ڈرانا ہو جو کہ فاعل کا فعل ہے اور دوسرے اس قابل کا قبول کرنا کہ وہ اس سے بچ جائے اسے انفعال کہیں گے۔ چنانچہ فرمایا گیا

انما تنذر من اتبع الذکر وخشی الرحمن بالغیب۔

اس انذار کے اثر کے متعلق یہ کہتے ہیں۔ سمایبعہ ضد، منہ منہ دی حق قوم۔ تو یہ انفعال کی تاکید ہوئی ایسے ہی ارشاد ہے

الی صلح کبھی تو نفس فعل کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اور کبھی اس کے قبول کا بھی اعتبار کیا جاتا ہے جیسے کہا جائے کہ آفتاب ہر چیز کو روشن کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ اس کی تنویر عام ہے۔ لیکن اگر کہا جائے

toobaa-elibrary.blogspot.com

کہ آفتاب ہوا کو روشن نہیں کرتا یہ بھی صحیح ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ شمس کی طرف سے تو کوئی رکاوٹ نہیں لیکن ہوا میں قبول کرنے کی استعداد نہیں۔ ایسے بعض اشیاء کم روشن ہوتی ہیں اور بعض زیادہ جبکہ آفتاب کی طرف سے یکساں ہو رہا ہے بلکہ قبول اور عدم قبول کی استعداد پر مدار ہے اسی طرح نبی ہر شخص کو ہدایت کرتا ہے مگر بعض عدم استعداد کی وجہ سے ان کو ان کے مقصد تک نہیں پہنچا رہا وجہ سے کہ انک لا تہدی من احببت یعنی ہدایت ایسے تمام کے ساتھ نبی کے اختیار میں نہیں ہے واما ثمود فہدینٰہم فاستحبوا العمی علی الہدیٰ اس جگہ وہ معنی ہیں کہ ہم نے سب کو ہدایت کی راہ دکھائی مگر ان میں صلاحیت نہیں تھی۔ اس لیے فاستحبوا العمی علی الہدیٰ تو خلاصہ یہ ہو کہ ہدایت کے معنی ایک ہی ہیں۔ صرف اعتبار کا فرق ہے

هدى للمتقين میں بظاہر دونوں معنی مطابق نہیں ہوتے کیونکہ جو متقی ہیں ان کو قرآن مطلب تک کیسے پہنچا سکتا ہے۔ وہ تو پہنچے ہوتے ہیں۔ اور تحصیل حاصل ہے پہنچے ہوئے کو پہنچانے کے کیا معنی ہیں کیونکہ آگے فرمایا گیا اولئک علی ہدی من ربہم۔ اگر ارائۃ طریق کے معنی ہوں۔ تو بھی مطابق نہیں۔ کیونکہ پہنچے ہوئے کو کیا بتلانا اسے اس کی ضرورت نہیں

چنانچہ بیضاوی وغیرہ نے لکھا ہے ای الصائرین الی التقوی یعنی جو آگے جا کر متقی بنیں گے۔ تعبیر یہ بھی تو ہو سکتا ہے مگر کسے یقین یؤمنون باب تعقیب میں استعارہ الی المتقین لکا یہ ایک تکلف ہے اور بلاغت اپنی پوری شان پر نہیں رہتی۔ البتہ اس کا یہ حل ہے جس کو بعض محققین کہتے ہیں کہ یہ اصلاح عصمۃ للمتقین کی قبیل سے ہے یعنی متقیوں کے بچنے کا ذریعہ اور ہتھیار ہے اس کا مطلب یہ ہو کہ جس کو استعمال حاصل ہو۔ یہ ہتھیار اس کا سبب ہے۔ جیسے المال غنی للغنی یعنی مال سبب غنی ہے

اسی طرح شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ متقین کے لیے پہلے ہدایت ثابت کرنا ضروری نہیں بلکہ یہی اقامت صلوۃ وغیرہ اس کے متقی بننے کا سبب ہیں تو مطلب یہ ہو کہ یہ ہدایت جو حاصل ہو رہی ہے یہی سبب ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے مطلب جو اس کے اصول پر عمل کرے گا اس کو صحت حاصل ہوگی۔ یعنی سبب صحت یہی بنتی ہے۔ کیونکہ صحت بدن کے لیے تین شرطیں ہیں

۱۔ احتراز عن المضرات۔ اس پر اطبا کا اجماع ہے۔ ورنہ دوا کا ترتیبی اثر ہے گا

۲۔ انتظام غذا۔ بغیر غذا کے انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ تو ملائم اور مناسب غذا تلاش کرنی ہوگی

toobaa-elibrary.blogspot.com

۲ دو چیزیں کبھی ایسی ہوتی ہیں کہ اس سے سابقہ بیماری کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اور کبھی ایسی دو چیزیں کھائی جاتی ہیں جو آئندہ آنے والی بیماریوں سے محفوظ رکھیں۔

چنانچہ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ روح انسانی کی غذا علوم حقہ اور معارف مقدسہ ہیں انہی سے روح زندہ رہتی ہے۔ اگر ایمان اور تصدیق حاصل نہیں تو غذا نہ ہوئی جس سے روح کا قیام ہو۔ اور نماز، صدقہ اور روزہ یہی خود نماز، جو یا زکوٰۃ وغیرہ یہ بعض بیماریوں پیدا شدہ کو زائل کرتی ہیں۔ اور آئندہ آنے والی بیماریوں سے محفوظ بھی رکھتی ہیں۔ اور سیئات سے اجتناب یہ احتراز عن مضرات ہے۔ ایسے یہ کتاب صحت انسانی روحانی قائم رکھنے کے لئے کفیل ہے۔ مگر اس شخص کے لئے جو تین چیزوں کا پابند رہے۔ وہ اتقاء ہے۔ اتقاء کا اصل قاعدہ ہے مضر چیزوں سے اپنے آپ کو الگ رکھے۔ در حقیقت کسی چیز سے ڈر کر بچنا اس سے تعبیر کبھی اتقاء کا ترجمہ ڈرنا اور کبھی بچنا کرتے ہیں۔ جیسے قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَهْلِیْکُمْ نَارًا۔ اور تقویٰ میں بے تدریجی سبب سے کہہ دیا گیا۔ یَخَافُوْنَ اور آگے فرمایا یَتَّقُوْنَ۔ تو ایک آیت میں دو الفاظ نے اس میں فرق یہ ہے کہ ڈر سبب دو کا ذکر کیا ہے۔ احساس خوف کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے کسی کو روکا جائے۔ در اصل کسی چیز کے خوف کی وجہ سے چھوڑ دیا جائے تو ایک خوف تو حالت فعل ہوا اور ایک خوف تارک فعل ہوا۔ اتقاء اس خوف کو کہتے ہیں جو کسی فعل کو ترک کر دے۔ اس لئے متقین فرمایا گیا۔

اور آگے اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ یہ غذا بتلائے۔ آگے سب دوا کا ذکر ہے کیونکہ صلوٰۃ کے متعلق فرمایا گیا

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔

صدقہ اور انفاق بھی تطہیر پیدا کرتے ہیں اور صیام سے تو تقویٰ پیدا ہوتا ہی ہے تو اس جگہ تینوں اصول بتلائے گئے تو جب یہ تینوں چیزیں پائی جائیں گی تو اس پر فرمایا گیا

اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ

اور متقی کے معنی ہیں کہ کبائر سے بچے اور اصرار سے بھی بچے۔ جن کی وجہ سے قوموں کی تباہی ہوتی ہے۔ چنانچہ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ

یہ شخص ہے جو رنا۔ ڈر کر وغیرہ سے بچتا ہے۔ اس میں اتنی طاقت ہے کہ وہ مسلمانوں کو بچا سکتا ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

گر اپنی طاقت کو مستعمل نہیں کرتا تو یہ متقی نہ ہوا کیونکہ علیحدہ کرنا تقوی ہے کے خلاف ہے

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خو

چو بگذشت بر عارف جنگجو

الغرض ﷺ تقوی کے معنی یہ ہیں کہ تمام امور سے بچنا جو مضر ہیں۔ اور جیسا کہ غزوہ احد کے بارے میں فرمایا گیا۔

حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ

یہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان کی طرف ہمارا دھیان نہیں ہوتا۔ لیکن وہ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو سعادت دارین سے روکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزوہ حنین میں تھوڑی سی دیر کے لئے مسلمانوں کو شکست ہو گئی جس کا سبب اپنی کثرت پر عجب تھا۔

يَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا

حاصل یہ ہوا کہ تقوی کو منحصر نہ کیا جائے۔ بلکہ زندگی کے تمام شعبہ جات کے جس قدر مضرات ہیں ان سب سے بچنا تقوی ہے اور ان سب کے قرآن مجید میں ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حتی کہ [illegible] کے لئے ان کو ذکر کیا گیا۔ اگر ان کو شمار کریں تو کتاب ہدایت ہو گی۔ اس کے لئے تین شرطیں ہیں۔ تقوی، ایمان بالغیب اور اقامت صلوۃ وغیرہ۔ تو پھر ان سب کا سبب بھی کتاب ہدایت ہوگی۔

تقوی ﷺ کے مراتب ہیں کیونکہ مضرات اور مہلکات کے مراتب ہیں۔ اس لئے تقوی میں بھی مراتب ہوں گے۔ سب سے پہلا درجہ یہ ہے کہ شرک و کفر سے بچے جو کہ سب سے بڑا ہے۔ دوسرا شرک و کفر سے اجتناب کے ساتھ کبائر سے بھی اجتناب کرے۔ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ الآیۃ تو اس اعتقاد سے دونوں متقی ہوئے لیکن دوسرا پہلے سے اعلی ہے [illegible] تقوی کے ساتھ صغائر سے بھی اجتناب کرے۔ [illegible] مشتبہات [illegible] حرمت تحقیقی نہیں بلکہ تردد [illegible] ہے یہ ان سے اعلی درجہ ہے [illegible] سب کو چھوڑ دے کے ساتھ بعض ایسی چیزیں جو فی نفسہ مباح ہوتی ہیں لیکن اگر ان کو کثرت سے کیا جائے تو وہ بعض ایسی غیر مباح ہو جاتی ہیں۔ تو ایسے مباح کو بھی چھوڑ دے۔ جیسے کھانا پینا زیادہ ہو یا کم۔ اگر کوئی شخص زیادہ اس سے نہیں کھاتا۔ تاکہ نیند نہ آئے غفلت طاری نہ ہو۔ اس کو بھی ترک کر دے۔ یہ تقوی کا اعلی درجہ ہے۔ جس کو ترمذی شریف میں فرمایا گیا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع ما لا بأس به حذرا مما به بأس

یہ انتہائی درجہ کا تقویٰ ہے۔ یہ درجہ اس امت میں ہر دور کے اندر پایا جاتا ہے۔

۲۔ ارباب سلوک نے بیان کیا ہے کہ دل کا دل اللہ تعالیٰ کے ماسوا سب کو ترک کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کے دل میں کوئی چیز نہ رہے۔ حتیٰ کہ اپنے وجود کو بھی نہ سمجھے۔ تو قرآن مجید بیان متقین کے لئے ہدایت ہوگا۔ تقویٰ کے متعلق ابن کثیر میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے سید القراء سے تقویٰ کے معنی پوچھے ہیں۔ شاید ان کا امتحان مقصود تھا۔ کیونکہ فاروق اعظمؓ بھی بدرجہ اولیٰ تربیت بھی کیا کرتے تھے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ

یا عمر ما سلکت علی طریق ذات شوک قال عمر تشمرت و حذرت

یعنی سیدھا دھندلا نہیں چلتا۔ بلکہ دامن سمیٹ کر بچا بچا کر کے چلتا ہوں۔ اور کبھی چھوٹے سے کانٹے میں بھی الجھ پڑتا ہوتا ہے کہ اس سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ فذلک التقویٰ بس یہی تقویٰ ہے اس میں وہ سب مراتب آگئے۔ کہ چھوٹے گناہ ہوں یا بڑے۔ جن میں ذرہ سا خطرہ ہو۔ کبھی وہ مقصد ہوا کرتے ہیں جیسے جوتے کے کانٹے سے ٹانگ کو کانٹا پڑے۔ یہ مثال ہے۔ یہ تقویٰ کی تعریف بہت بہتر ہے۔ در حقیقت صحابہؓ کرام درسگاہ نبوت کے علوم حقیقت پر مشتمل ہوتے ہیں۔ تو جیسے بڑے کانٹے سے بچنا پڑتا ہے۔ ایسے چھوٹے کانٹے سے بھی بچنا پڑتا ہے تو اگر کوئی شخص ایسے رستے پر جانا چاہتا ہے۔ یہ جب ہو سکتا ہے۔ کہ ان کانٹوں کو بھی دیکھے۔ ورنہ اگر اسے راستہ بھی نظر نہیں آتا تو سوائے ٹھوکریں کھانے کے اور کسی موذی جانور کے شکار ہونے کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ تو اس کے لئے ایک روشنی کی ضرورت ہے۔

چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا۔ هدی للمتقین ای نور للمتقین یعنی متقی کو جادہ رو دیوار سے گذرنے کے لئے نور کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کتاب ہے۔ اس کی روشنی میں ان کانٹوں کو دیکھتے جاؤ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے۔ کہ سالک کے اندر بھی روشنی ہو۔ ورنہ اگر ایسے راستہ پہ چلے اگرچہ آفتاب بھی موجود ہو۔ تو وہ بغیر ٹھوکریں کھانے کے اور کیا کرے گا۔ تو ایک اندرونی روشنی کی بھی ضرورت ہے۔ وہ توفیق نور ہے۔ وہ ہر ایک کا حصہ نہیں

أُولٰئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ یہ اندرونی روشنی نور ہے۔ اسے توفیق نور کہا جاتا ہے چنانچہ مسند امام احمد میں ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا۔ تو وہ ایک ظلمت تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے

toobaa-elibrary.blogspot.com

مخلوق کو پیدا کیا۔ تو وہ ایک ظلمت میں تھی تو اللہ تعالیٰ نے نور ڈالا۔ جس نے اس نور سے کچھ حصہ پایا وہ ہدایت پا گیا۔ وہ جس سے کچھ نہ پایا تو وہ گمراہ ہے۔

سہ

جہاں جہاں گذر ہو وہاں وہاں سحر ہوئی
جہاں جہاں گذر نہیں ہوا وہاں ہے رات تک

یہی وجہ ہے کہ ابوجہل ابولہب وغیرہ گمراہ ہوئے کیونکہ ان میں توفیق نور نہیں تھی۔

لاریب فیہ ایک دعویٰ تھا۔ اس کا ثبوت ھدی للمتقین ہے۔ ثبوت دو قسم کے ہوتے ہیں۔ نظری اور عملی جیسے کوئی پہلوان کہے کہ مجھ سے کوئی جیت نہیں سکتا۔ وہ میرے مقابلہ میں آجائے۔ لاریب کا ثبوت استدلالی اور نظری تو وان کنتم فی ریب مما نزلنا میں۔ مگر وہ عملی ثبوت ہے جس میں پیش کیا کہ اس کتاب نے جو کچھ اثر کیا ہے۔ وہ اخلاق پہ قلوب پر وہ یہ ہے۔ کہ جو قومیں فسق و فجور کفر و شرک وغیرہ کی نہایت حالت تک جا پہنچی تھیں۔ جن پر اخلاقی موت واقع ہو چکی تھی۔ تو یک ہی نے یک کتاب لا کر ان کو اس گڑھے سے نکال کر زندہ کر دیا۔ اس کتاب کے اثرات ہیں۔ جیسے یک نیا پڑھا ہوا طبیب آ کر یک سائن بورڈ لگاتا ہے۔ اور اشتہار تقسیم کرتا ہے۔ تو چند روز میں چند مریض اس کے پاس جاتے ہیں۔ کہ بھائی اسے آزمائیں۔ پس ایک مریض تپ دق کا بھی گیا۔ جسے اس کے علاج سے فائدہ ہو گیا تو اس شہر کے لوگ جوق در جوق اس طبیب کے پاس آنے لگے۔ اب اس کے طبیب ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہے گا۔ مگر اس طرح کے پچاسوں مریض جن کو اطبا جواب دے چکے تھے۔ وہ شفایاب ہو جائیں۔ تو پھر اس کی طبابت میں کوئی شک و شبہ نہیں رہے گا۔ مگر سارا شہر شفایاب ہو جائے۔ تو پھر ساری دنیا کے لوگ آنے شروع ہو جائیں گے۔ اگر اس نے ایسے چند کے بدلے ہوں کہ وہ مریض خود دوسروں کا علاج کرنے لگے۔ تو پھر تو اس کی طبابت چمک اٹھے گی۔ ویسے ہی قرآن مجید نے ان مُردوں میں جن پہ اخلاقی موت آ چکی تھی۔ ایک روح پھونک دی۔ اب ان میں سے یک گروہ تیار ہو جو کہ سب کے سب دنیا سے تھے۔ اور جہاں جہاں وہ پہنچے اوروں کو بھی ہدایت پر لاتے۔ تو ایسی تاثیر کے دیکھنے کے بعد اب کون کوئی دلیل طلب کر سکتا ہے تو یہ لاریب فیہ کی عملی دلیل ہوئی۔ آگے متقین کی صفات بیان کی گئی ہیں۔

الذین یؤمنون بالغیب وہ لوگ جو ایمان لاتے، ان دیکھی چیز پر۔ یہ صفت خصوص متقین کی صفت ہے۔ تقویٰ کے کئی مراتب بیان ہو چکے۔ اگر تقویٰ کے عام معنی یعنی پہلے معنی مراد ہوں۔ تو یہ صفت مخصصہ ہوگی

toobaa-elibrary.blogspot.com

اگر وہ سمجھ جائے۔ کہ تہجد و ذکر و دعا سے اجتناب کرے تو وہ تب ہو سکتا ہے۔ کہ قیامت صلوٰۃ وغیرہ مناسب طور پر درست ہو تو اس وقت وہ صفت کا شغف یا وہ حب نہیں رہے گی۔ سید شریف صفت کا شغف اور وجہ میں یہ فرق بیان کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی صفت کو جانتا ہے پھر مدح کے طور پر اس کے سامنے وہ صفت بیان کی جاتی ہے۔ اگر جانتا نہیں تو پھر وہ اس مدح کے سننے کا شغف نہیں رہے گی۔

یؤمنون ﷺ ایمان سے مشتق ہے۔ اور بالغیب اسی یؤمنون کے متعلق ہے۔

غیب یہ مصدر ہے بمعنی غائب جو حاضر کا مقابل ہے۔ لغت میں غیب اس چیز پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ حس کا ادراک نہ تو حواس ہو۔ اور نہ ہی بداہت عقل کر سکے گویا وہ چیز محسوس بھی نہیں۔ اور معقول بدیہی بھی نہیں پھر اس کے ادراک کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر کوئی دلیل نصب کر دے۔ پھر وہ دلیل استدلالی ہوگی۔ یعنی کسب و اکتساب سے ترتیب مقدمات دے کر حاصل ہو یا کسی مخبر صادق نے ہم کو خبر دی ہو یہ دلیل نقلی ہے۔ جیسے کسی نے مکہ معظمہ نہیں دیکھا اور جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ہم نے دیکھا اور نہ کفار نے تو ایسی چیز حس کا ہم حواس اور بداہت عقل سے ادراک نہ کر سکیں۔ اسے غیب کہتے ہیں۔ تو دلیل عقلی اور نقلی صحیح اس غیب کے ادراک کا طریقہ ہوگا۔ تو بالغیب میں با تعدیہ کا ہے جو کہ یؤمنون کا صلہ ہے۔ شرعی معنی یہ ہیں کہ غیب وہ ہے جو حواس اور بداہت عقل سے خارج ہو۔ اور اس کا ادراک بذریعہ خبر کے ہو۔ جیسے جنت۔ دوزخ۔ قدر و تقدیر۔ کتب۔ انبیاء اور رسل من حیث الاسم رسل یعنی محض دیکھنا مراد نہیں۔ بلکہ حیثیت رسالت سے دیکھنا مراد ہے۔ یہ یہاں بار رسالت حواس سے نہیں۔ بلکہ ہمارے معلوم سے۔ غیب کے بہت سے معانی بیان کیے گئے ہیں لیکن مناسب کو جمع کیا جا سکتا ہے جیسے جبرائیل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر پوچھا ما الایمان ﷺ تو یہ سب چیزیں غیب کے تحت میں داخل ہیں کیونکہ ان کو نہ ہم حواس سے ادراک کر سکتے ہیں اور نہ ہی بداہت عقل سے زیادہ واضح یہی ہے۔ اگر سمجھانے والے غیب کے ماتحت وعد و نکتہ وغیرہ فرماتے تو تفصیل ہو جاتی۔ جیسا کہ اسی سورۃ بقرہ میں دوسری جگہ متعلقات ایمان بیان کیے گئے ہیں۔ مگر اس عنوان سے جو یہاں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ایک نکتہ ہے۔ اصل یہ ہے۔ کہ دنیا میں بعض تو ایسے لوگ ہیں کہ جن کی نظر مادہ اور مادیات پر منحصر ہے جیسے یورپ والے محض مادہ کو مانتے ہیں۔ جیسے وہ اعتقاد رکھتے ہیں انبیاء، ملائکہ، اور عالم آخرت کو کچھ بھی نہیں مانتے یعنی سوائے محسوسات کے، وہ کسی چیز کے وجود کو نہیں مانتے چنانچہ بہت مدت تک روح کو بھی نہیں مانتے تھے

toobaa-elibrary.blogspot.com

ملحد اب ایک جماعت پیدا ہوئی ہے کہ اس نے کہا ہے کہ ہمیں ماننا پڑے گا کہ محسوسات کے علاوہ اور عالم بھی ہے۔ دائرۃ المعارف جو ابن القرن دو لوں نے ان موسا سینٹوں کی تفصیل لکھی ہے کہ جنہوں نے اس پر بحث کی ہیں لکھی ہیں در آخر میں لکھا ہے کہ یہ حماقت ہے کہ مادہ کے ماسوا عالم ارواح کو مانا جائے لیکن وہ ملائکہ اور جن کو اب بھی نہیں مانتے۔ اس قسم کا ایک فرقہ عرب میں تھا جو کہتے تھے۔ وما یہلکنا الا الدھر ان کے نزدیک بھی مادہ کوئی عالم نہیں تھا۔ یونان میں بھی بہت لوگ ایسے گزرے ہیں البتہ مسلمانوں میں فرقے کوئی مادہ کہتا ہے کوئی طبع کہتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب سے عالم بنا ہے ان میں کثرت ان لوگوں کی ہے جو مادہ کے سوا ایک عالم اور کو بھی مانتا رہا ہے۔ تو جو شخص محسوسات کے علاوہ اور کسی عالم کو نہیں مانتا تو مجید اس کے لئے کیسے ہدایت ہوگا۔ کیونکہ وہ اس کے وجود کو مانتے نہیں۔ اس سے نفع حاصل کرنے کی شرط ہے۔ کہ محسوسات کے ماورا ایک عالم کو ماننا پڑے گا

بعض کہتے ہیں کہ یؤمنون کے معنی یخشون کے ہے حالانکہ خشیت بعید ہے یہاں ۔ بلکہ یہاں کے قرات میں سے ہے۔ تو معنی ہوں گے کہ وہ ڈرتے ہیں بذریعہ غیب کے۔ اس کی تائید میں دمشقی رحمۃ اللہ بالغیب سے ہوتی ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یؤمنون یعنی خلوص سے مانتے ہیں ان لوگوں کے مقابلہ میں جو کہ منافقانہ تکذیب کرتے ہیں کہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ حضور و غیبت دونوں صورتوں میں ایمان لاتے ہیں جیسے علم حاضر و غیب یعنی پیٹھ پیچھے ہیں یہ جیسا ہے۔ مگر اس میں تکلف ہے۔ اور ایک اور تفسیر ہے جو حدیث اور آثار صحابہ سے معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے سوال کیا کہ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ ملائکہ کا ایمان عجیب ہے۔ تو آپ نے فرمایا ان کا ایمان کیا عجیب ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہیں اور اس کا کلام سنتے ہیں۔ تو صحابہ نے عرض کیا کہ پھر انبیاء علیہم السلام کا ایمان تو آپ نے فرمایا کہ ان پر تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا ہے تو صحابہ نے کہا کہ پھر ہمارا ایمان عجیب ہوگا تو فرمایا تم آپ کے ساتھ رہتے ہیں آپ سے وحی سنتے ہیں تمہارا ایمان کیا عجیب ہے بلکہ وہ قوم ہے کہ جو تمہارے بعد میں آئے گی جنہوں نے نہ تو فرشتوں کو اترتے دیکھا اور نہ ہی معجزات دیکھے بلکہ ایک کاغذ پر لکھے ہوئے قرآن پر ایمان لے آئے۔ اور اس پر یہ آیت پڑھی تو اب معنی یہ ہوں گے۔ کہ وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں غائبانہ۔ یعنی ان کے سامنے کوئی چیز نہیں۔ بلکہ ان کے بعد چند جملے ہیں۔ تو غیب سے مراد وہ ہوئے جو آپ کے زمانہ میں نہیں تھے۔ اس کی تائید سورۃ جمعہ کی آیت

toobaa-elibrary.blogspot.com

وَ آخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ۔

یہ تفسیر اگرچہ اچھی ہے۔ مگر پہلی تفسیر کو جمہور نے ترجیح دی ہے۔ اس صورت میں بالمصاحبت کی ہوگی۔ اور راجح تفسیر کی صورت میں صلہ کی ہوگی۔ ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ اگر غیب سے غائبانہ مراد لیا جائے۔ تو اس میں احراج صحابہ کا لازم ہوگا۔ کہ ان کے لئے مدح نہیں۔ اس اگر یوں کہا جائے۔ کہ جب ان لوگوں کے لئے مدح ہے جو حاضر نہیں تھے۔ جو لوگ حاضر تھے ان کے لئے تو بطریق اولیٰ مدح ہے۔ باقی اس حدیث مرفوع کا جواب یہ ہوگا۔ کہ یہ حدیث استیناس کے لئے ہے۔ مدلول یہ نہیں بلکہ دلالۃ اس لفظ پر انس پیدا کرنے کے لئے آیت کو پڑھا گیا۔ مگر راجح وہی پہلے معنی ہیں۔ کیونکہ جو چیز حاضر ہے تو مدرک اس کے یقین کو کسی صورت میں نہیں نکال سکتا۔ جیسے برف کے ٹکڑے پر ہاتھ رکھا جائے۔ اور کوئی یقین کرے کہ اس میں ٹھنڈک نہیں۔ ایسے ہی بدیہیات عقلیہ ان کے ماننے میں کوئی کمال نہیں ہوتا۔ بلکہ معتبر وہ ایمان ہے۔ جو ایمان بالغیب ہو۔ یعنی حواس وغیرہ سے نہ جانے کے باوجود مخبر صادق کی خبر کی سا پر ایمان لائے جو چیز عقل وغیرہ کے ذریعہ حاصل ہو اسے علم اور معرفت کہا جاتا ہے۔ اسے ایمان نہیں کہا جاتا۔ پس ایمان وہ ہو جو مخبر صادق کے کہنے سے ایمان لائے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان غرغرہ یعنی میت جانکنی کی حالت تک پہنچ جائے۔ اس وقت عالم غیب اس پر منکشف ہو جاتا ہے۔ اس وقت کا کوئی ایمان معتبر نہیں۔ اور نہ ہی توبہ فائدہ دے گی۔ جیسے فرعون ایمان لایا۔ تاہم اسمیں

جواب ملا۔

آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ مِنْ قَبْلُ اور فرمایا گیا لَيْسَتِ التَّوْبَةُ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ الْمَوْتُ

قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ

تو یہ ایمان یاس اور یاس معتبر نہیں کہ جنت اور اس کے رسول کے کہنے پر اس نے نہیں مانا۔ بلکہ مشاہدہ کے بعد مانا۔ رسول کے کہنے پر نہ مانے۔ پھر منکشف ہو جائے۔ تو یہ حق الیقین کا درجہ ہے۔ اس سے وہ مسئلہ کہ مشہور ہے کہ شیخ اکبر فرعون کے ناجی ہونے کے قائل ہیں۔ اس پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا۔ کہ ایسے بڑے شیخ کیسے اس کے قائل ہوسکتے ہیں۔ لیکن شیخ عبدالوہاب شعرانی جو اکابر علماء میں سے ہیں الیواقیت و الجواہر ان کی کتاب ہے جس میں انہوں نے عقائد اہل سنت و الجماعت کو بیان کیا ہے۔ پھر شیخ اکبر کے کلام کو نقل کیا ہے۔ اس کتاب کے کہتے ہیں دو مہینے میں یہ کتاب لکھی ہے۔ اور سارا ہے میں فتوحات مکیہ کو اول سے آخر تک دیکھی ہے۔ اس میں اس مسئلہ دعویٰ پر بھی بحث کی ہے۔ اور صراحۃً لکھا ہے کہ شیخ نے یہ لکھا ہے کہ فرعون ایمان لایا ہے جیسے قرآن مجید سے پتہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

چلتا ہے۔ لیکن جو شیخ اسی آیت کو آگے نقل کرتے ہیں کہ جس سے ایمان ثابت نہیں ہو

مولانا عثمانی فرماتے ہیں کہ میں نے خود فتوحات کو دیکھا مگر یہ عبارت مجھے نہیں ملی۔ لیکن جب خود دیباچہ دیکھا تو اس میں لکھا تھا کہ جتنے نسخے مصر وغیرہ میں ہیں وہ سب محرف ہیں۔ جبکہ میرے سامنے وہ نسخہ ہے جو شیخ کے سامنے پڑھا گیا۔ اور اس پر شیخ کے دستخط ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ یہ تعجب مکرر کہ حاسد نے میری کتب میں تحریف کی ہے جس کی بناء پر میری تکفیر کے فتوے جاری ہوئے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ ایمان فرعون کا کی حیثیت ہے۔ مت مرنے کے بعد تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس لفظ عین کو عقیدہ کرنے کا ہی مقصد ہے کہ اس پر تنبیہات کی گئی ہیں

ایمان کے لغوی معنی امن کے ہیں۔ امن خوف کی ضد ہے۔ چنانچہ فرمایا

منهم من خوف ومن خوفهم امن امنة مطمئنة

اس سے معلوم ہوا کہ امن خوف کی ضد ہے۔ تو ایمان کے معنی ہوں گے امن دے دینا۔ بے خوف کر دینا لیکن لغت میں یہ معنے لکھتے ہیں۔ کہ لا ایمان لمن لا امانة له۔ چونکہ حسن حنیفہ مامون رشید کے زمانہ سے مسلمانوں میں گھس آیا ہے۔ بنا علیہ تصدیق کو منتج کرنا پڑے گا۔ لغت کے اعتبار سے تصدیق کے معنی سچا سمجھنے کے نہیں بلکہ سچا ماننے کے ہیں یعنی اس یقین کے ساتھ جھک جانا کہ اگر کوئی جانتا تو ہے لیکن ہٹ دھرمی کی وجہ سے نہیں مانتا تو اسے تصدیق نہ کہا جائے گا۔ بلکہ دعاء اور اس کا قبول کرنا سچا قرار دینا۔ سے بحث میں تصدیق کرنا کہتے ہیں۔

ادعان لنفس لحکم لمخبر و قبوله وجعل مخبره صادق

بہت سے لوگ بعد کے دور کی اصطلاحات کو عرب میں گھسا چاہتے ہیں۔ حالانکہ عرب کے وہی سادہ الفاظ سادہ معانی میں مستعمل ہیں۔ حتیٰ کہ فقہ کی اصطلاحات کا بھی قرآن و حدیث میں عتبار نہیں کیا جاتا۔ پھر یہ لفظ لغت میں چند طرق پر مستعمل ہوتا ہے کبھی تو متعدی بنفسہ ہوتا ہے۔ جیسے امنهم من خوف میں۔ اور کبھی با واسطہ باء جیسے امن الرسول بما انزل الیه "اس وقت یہ عترف کے معنی کو متضمن ہوتا ہے کیونکہ باء اعتراف کا صلہ آتا ہے۔ اور کبھی لام آتا ہے قالوا نؤمن لك " یہاں ایمان اپنے معنی اذعان پر ہے اور اذعان کا صلہ لام آتا ہے۔ قرآن مجید میں تو یہی تین طریقے ہیں لیکن حدیث میں بعلیٰ بھی مستعمل ہے۔

مامن نبی الا وقد اوتی من الآیات ما مثله من علیه البشر

toobaa-elibrary.blogspot.com

اسں حدیث کے سوا اور کسی جگہ نہیں دیکھا گیا اور علی سمت کے لئے ہے

اور شرعی معنی محققین فرماتے ہیں کہ جو لغت میں ایمان کے معنی ہیں۔ وہی شرعی معنی ہیں۔ صرف اس کا متعلق بیان کر دیا کہ کس چیز کی تصدیق ہے۔ وہ وہ چیزیں ہیں جن کو شارع علیہ السلام مخلوقات کی طرف لاتا ہے۔ جیسے مشکوٰۃ شریف میں ہے "الایمان ان تؤمن باللہ و ملائکتہ"

اسی سے یہ سمجھ میں آ گیا کہ شریعت میں وہی معنی ایمان مراد ہے۔ جیسے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا۔ اخبرنی عن الایمان تو آپ نے متعلقات بیان کر دیے ان تؤمن باللہ" یہ دعاں اور قبول فعل ہے فعل نفس میں ہے پس تصدیق اقسام علم میں سے نہ ہوگا کیونکہ ایمان میں محض اعتراف کافی نہیں جیسے فرعون اور ان کی قوم کے متعلق فرمایا گیا۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ

معلوم ہوا کہ یقین کے باوجود جحود تھا۔ وہ یقین شرعی نہیں تھا۔ اس سے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے فرمایا گیا

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

علم تو تھا۔ لیکن اس یقین و علم کے سامنے نہیں جھکا۔ اس لئے اعتبار نہیں کیا گیا تیسری جگہ یہود کے حق میں فرمایا گیا۔

يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ

تو علم و معرفت تو جمع ہیں۔ مگر ایمان نہیں۔ اور سب سے اچھا ثبوت حدیث کا وہ ہے جو ابو طالب کے متعلق فرمایا گیا۔ حالانکہ وہ آپ کے سب سے زیادہ خادم تھے۔

واللہ لن یصلوا الیک بجمعہم حتی اوسد فی التراب دفینا ودعوتنی

وعلمت انک صادق ولقد دعوت وکنت قبل امینا"

اس کے باوجود کہ علم بھی ہے۔ اور اظہار بھی ہے۔ مگر قبول نہیں اس لئے یہ وہ ہوا کہ جب بستر مرگ پر تھے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اے چچا ایک مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کہہ دے۔ تاکہ مجھے جھگڑا کرنے کا موقع مل جائے۔ مگر اس وقت ان کا کہنا تھا کہ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ میری قوم کی لڑکیاں تک مجھے طعنہ دیں گی کہ ابو طالب جہنم کی آگ سے ڈر گیا۔ اور میں آپ کی آنکھ کو ضرور ٹھنڈا کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ قبول کے بغیر ایمان

toobaa-elibrary.blogspot.com

معتبر نہیں کیونکہ ارشاد ربانی ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔

الحاصل ایمان لغوی اور شرعی کے ایک معنی ہیں۔ البتہ شریعت متعلقات بیان کرتی ہے۔ مرجئہ کہتے ہیں کہ ایمان معرفت کا نام ہے۔ تو اس کا جواب یہاں سے ہو جائے گا۔ کہ پھر تو سب یہودی مومن ہوئے۔ اور فرقہ کرامیہ جو محمد بن کرام کے معتقدین ہیں ان کا بھی رد ہو گیا جو محض اقرار باللسان کو ایمان کہتے ہیں اس لئے کہ ایمان کے یہ معنی ہیں کہ مصدق مخبر وغیرہ کو اپنی تکذیب سے مامون کر دے۔ تو تصدیق فعل نفسی ہو۔ اور منطق جن کا شیخ اور رئیس ابو علی سینا ہے۔ جس کے متعلق مولانا روم نے فرمایا۔

کہ تو یہ دل ز سینہ سینا مجو

وردشنی ز چشم نابینا مجو

فارسی کی کتب میں اس نے تصدیق کا ترجمہ گرویدن و باور کردن اور عربی کتب میں لکھا ہے ما یخالف التکذیب والانکار۔ تو جب تصدیق، تکذیب اور انکار کی ضد ہوئی تو وہ اقرار اور قبول ہوگا۔ لیکن ہم کو جو غلطی لگی ہے وہ ان رسائل سے ہے۔ کہ جن میں علم کی تقسیم تصور اور تصدیق کی طرف کی گئی ہے۔ حالانکہ ابن سینا کی تصریحات اس کے خلاف ہیں۔ ورنہ وہ معرفت جس میں یقین اور اذعان نہیں۔

علامہ تفتازانیؒ اس کو تصور میں شمار کرتے ہیں۔ صدر الشریعتؒ نے اس کو تصدیق کی تو شاید رکھا ہے۔ مگر ہم ان کے درپے نہیں ہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے کتاب الایمان لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے جہاں یہاں کے لغوی معنی بیان کیے ہیں۔ تو کہا ہے۔ کہ تتبع عرب جہاں اس کو استعمال کرتے ہیں کہ ہر تصدیق کو وہ ایمان نہیں کہتے۔ بلکہ جہاں کسی چیز میں تردد اور غور و فکر کی ضرورت ہو۔ تو ایمان ہر تصدیق کو نہیں کہتے۔ بلکہ جو تصدیق مہتم بالشان ہو اور اس میں انکار اور تکذیب کا شائبہ نہ ہو۔ اور اس میں غور و فکر کی ضرورت ہو

الحاصل التصدیق بما علم مجیئ الرسول بہ ضرورۃ اجمالاً فیما علم اجمالاً وتفصیلاً فیما علم تفصیلاً

یہ تعریف فقہاء اور متکلمین کرتے ہیں۔ تصدیق تو انقیاد باطنی کو کہتے ہیں اور کسی رسول کو رسول ماننا اس کی عصمت کو ماننا ہوتا ہے۔ رسول کے کسی ایک لفظ کو بھی خلاف واقع کہنا در حقیقت رسول کی تکذیب ہے

toobaa-elibrary.blogspot.com

کہ اس کی روایتوں پر کسی کو کوئی اعتبار نہیں ہے تو اس کے لئے صدق لازم ہو جیسے کہ تصدیق کا مقتضی ہے۔ اور متکلمین کی تعریف کا مقتضی یہ ہے کہ جن چیزوں کا ہمیں قطعی علم ہو جائے کہ یہ رسول لایا ہے اس میں کی تصدیق بغیر کسی حجت کے کرنا پڑے گی۔ اور ضرورت کی قید کا فائدہ یہ ہے کہ جو قطعی نہیں بلکہ ظنی ہے اگر کوئی اس کا انکار کر دے تو اسے کافر نہیں کہہ سکتے بلکہ مبتدع کہا جائے گا۔ اگر کوئی چیز قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے۔ اگرچہ وہ مستحب بھی ہو تو اس کا انکار کرنا کفر ہوگا جیسے مسواک کرنا تو تواتر سے ثابت ہے کہ بہت سی جماعتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتی آرہی ہیں کہ آپ اسے استعمال کیا کرتے تھے۔ تو اس کے مستحب ہونے کا انکار کرے گا وہ کافر ہوگا۔ کیونکہ تواتر کئی قسم ہوتا ہے۔

۱۔ تواتر اسناد کہ اس کی اتنی سندیں ہیں کہ ان کے روات کا کذب پر اتفاق کرنا محال ہو جیسے مسح علی الخفین کی روایت اسی صحابہ کرام سے منقول ہے۔ اس سے کم نہیں۔

۲۔ تواتر طبقہ۔ راویوں کی بحث نہیں بلکہ تمام کثیر طبقہ اس کو نقل کرتا ہے قرناً بعد قرنٍ طبقۃً بعد طبقٍ اگرچہ اس کی سند بیان نہیں کی جاتی اور ان کا کذب پر جمع ہونا بھی محال ہے۔ اسے طبقہ کا تواتر کہتے ہیں جیسے قرآن مجید کہ یہ قرناً بعد قرنٍ منقول ہوتا ہوا آیا ہے۔ یہاں تک کہ عیسائی، ہندو جو اس کو مانتے بھی نہیں وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ وہی قرآن ہے کہ جس کو کثیر تعداد میں کہ جن کا حصر نہیں ہو سکتا۔ نقل کرتا آیا ہے۔

۳۔ تواتر قدر مشترک۔ ایک چیز ایک ہی سے یک دو سندوں سے اور دوسری چیز اسی سے اور دو تین سندوں سے منقول ہو۔ مگر ان میں قدر مشترک ہے جیسے مثلاً کوئی شخص حاتم طائی کے پاس گیا۔ اور اس نے کہا کہ حاتم طائی نے مجھے گھوڑا دیا۔ دوسرے نے کہا مجھے کپڑے دیئے۔ علیٰ ہذا القیاس سو تک آدمیوں نے کہا۔ گو یہ ہر ہر جزئی متواتر نہیں۔ مگر اس کی قدر مشترک یعنی جود و سخا متواتر ہے۔ ایسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی معجزات ہیں کہ جیسے آپ نے پیالہ میں انگشتہائے مبارکہ کو رکھا تو ان سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا دوسرے نے کہا کہ آپ نے یک دو آدمیوں کا کھانا کثیر جماعت میں تقسیم فرمایا اب اگر سو دو سو اس قسم کے واقعات منقول ہوں۔ اگرچہ ان میں سے ہر جزئی متواتر نہیں مگر قدر مشترک یعنی نفس معجزہ متواتر ہے

۴۔ تواتر تعامل و توارث یعنی اس کی کوئی سند ہے اور نہ ہی طبقہ طبقے سے نقل کرتا ہے مگر

toobaa-elibrary.blogspot.com

سنت کا عمل اس پر چلا آ رہا ہے۔ کہ سارے لوگ اس پر عمل کرتے ہیں جیسے عرفات اور مزدلفہ میں ظہر اور عصر مغرب و عشاء کی نماز کو جمع کیا جاتا ہے اگر ہمارے پاس کوئی سند نہ ہو۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس پر سارے لوگوں کا تعامل ہے تو سنت ہی متواتر ہو جائے گا

یہ مطلب کہ جو چیز تواتر اور قطعی طور پر ثابت ہو تو اس کا منکر کافر ہوگا۔ اگرچہ ایک بات کا بھی انکار کرے جیسے ارشاد ربانی ہے "ولو تقول علینا بعض الاقاویل" جس سے یہ بتلانا ہے کہ نبی سے یہ ہو نہیں سکتا۔ کہ اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر بیان کرے

اجمالاً فیما علم اجمالاً اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز نصوص قطعیہ سے اجمالاً ثابت ہوئی ہے تو اجمالاً مانا جیسے نصوص سے حضرت جبرئیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام حتیٰ کہ جمیع ملائکہ پر ایمان لانا قطعی ہے۔ تو ملائکہ پر اجمالاً ایمان لانا فرض ہے۔ جیسے ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے جیسے جبرئیل میکائیل اور عزرائیل پر تفصیلی ایمان لانا اور ایسے انبیاء علیہم السلام کے متعلق اور ایسے عذاب قبر پر ایمان لانا فرض ہے۔ تو جو شخص عذاب قبر کا انکار کرے۔ تو وہ کافر ہے اگر کوئی عذاب کا انکار کرے۔ تو کافر نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ ظنی ہے اور تصدیق قلب کا ایک فعل ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ اور علماء محققین نے لکھا ہے کہ تصدیق قلبی کلام نفسی کا نام ہے یعنی تصدیق معرفت کو نہ کہا جائے گا۔ تو جو تصدیق کا اطلاق معرفت پر کرتے ہیں تو یہ اطلاق تصدیق مجازی ہے جیسا کہ حضرت امام ابو حنیفہ کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ وہ ایمان معرفت کو کہتے ہیں مگر اس جگہ معرفت تصدیقی کا ارادہ دیتے ہیں کیونکہ جب آپ کا کسی عالم سے مناظرہ ہوا۔ تو آپ نے فرمایا تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کر […] صاحب۔ ایمان کے معنی معرفت کے کیسے کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ وہ مجازی اطلاق ہے یہ ایک چیز باقی رہ جاتی ہے کہ آیا اقرار باللسان بھی ضروری ہے یا نہیں۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے

۱۔ شیخ ابوالحسن اشعری کی اصح روایت یہ ہے کہ اقرار ایمان کا […] کے لیے شرط ہی نہیں ہے یعنی اگر کوئی اقرار باللسان کرے۔ تو اس پر احکام اسلامی جاری ہوں گے مگر آخرت میں اس کی نجات کا باعث نہ بنے گا اسی سے حضرت امام ابو حنیفہ ایمان مجموعہ تصدیق اور اقرار کو کہتے ہیں البتہ دوسری روایت کے مطابق ایمان تام تو تصدیق کا ہے۔ مگر یہ تصدیق تب حق ہے جب کہ اقرار باللسان بھی ہو۔ تو وہ اقرار کو شرط قرار دیتے ہیں مگر یہ شرط اکراہ میں ساقط ہو جاتا ہے۔ لیکن تصدیق قلبی کبھی بھی ساقط نہیں ہوتی۔ قلبی تصدیق اور ایمان […] ابوالحسن اشعری کی دوسری روایت حضرت امام ابو حنیفہ کے مطابق ہے

toobaa-elibrary.blogspot.com

تشریح: ان حضرات نے ایک قید کا اضافہ کیا ہے کہ جو لوگ اقرار کو شرط قرار نہیں دیتے۔ ان کے ہاں یہ قید ہی ہے کہ جس شخص کو تصدیق قلبی حاصل ہے مگر اقرار باللسان نہیں ہے۔ وہ ان کے نزدیک ایسا ہو کہ اگر مجھ سے ایمان کا مطالبہ کیا گیا تو میں اقرار کروں گا۔ اگر وہ مطالبہ کے وقت بھی اقرار نہ کرے تو پھر مومن نہیں ہوگا۔ اگر وہ اقرار کرے اور نہ انکار کرے۔ ہندوستان میں بھی ایسی قومیں پائی جاتی ہیں تو امام ابو الحسن اشعری کا مسلک صحیح ہوا۔ کیونکہ اس میں وسعت ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ آیا اعمال جو خوارج و معتزلہ کے نزدیک جز ہیں تو یہ بھی ایمان کا جزو ہیں یا نہیں۔ یعنی آیا ایمان تصدیق بالجنان، اقرار باللسان و عمل بالارکان اس مجموعہ کا نام ہے یا عمل بالارکان کو دخل نہیں ہے اس میں سخت اختلاف ہے۔ خوارج و معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ عمل ایمان کا جزو حقیقی ہیں۔ یعنی جزو کے فوت ہو جانے سے کل فوت ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی عمل وغیرہ کو چھوڑ دے گا تو وہ مومن نہیں رہا۔ پھر ان میں باہم اختلاف ہے۔ خوارج کہتے ہیں کہ وہ کفر میں داخل ہو گیا۔ اور معتزلہ کہتے ہیں کہ وہ نہ مومن اور نہ کافر ہے بلکہ بین بین ایک درجہ ہے لیکن اس کے مخلد فی النار ہونے پر دونوں متفق ہیں۔ ان میں فقط لفظی مرکبیہ ہے مقصد ایک ہی ہے ان کے نزدیک اس کی مثال ایسی ہے کہ جوہر ... سے یہ لازم نہیں کہ وہ صورت بھی ہو بلکہ جائز ہے کہ وہ حسن متشکل ہو۔

فرقہ مرجیہ یہ کہتا ہے کہ عمل کو ایمان میں دخل ہی نہیں۔ بلکہ اگر کوئی شخص ایمان یا اسلام کے فرض پر عمل نہ کرے تو وہ دوزخ میں نہ جائے گا۔ البتہ جنت میں بدرجہ عادت ہے۔ ان کی حجت یہ ہے کہ جیسے کافر جنت میں نہیں جا سکتا۔ ایسے ایمان بھی جہنم میں نہیں جا سکتا۔ جیسے کافر کے حق میں کوئی طاعت موثر نہیں اسی طرح ایسے مومن کے بارے میں کوئی معصیت موثر نہیں۔ خوارج و معتزلہ کے دلائل تو یہ نصوص دیتے ہیں۔ لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ

ان کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی کو یقین ہے کہ یہ آگ جلا دے گی پھر وہ اس میں ہاتھ ڈال دے تو گویا اسے اس کا یقین ہے کہ یہ جل جائے گا۔ ایسے ہی جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو مانتے مگر پھر بھی کبائر کا ارتکاب کرتا ہے تو گویا اسے یقین ہی نہیں تھا۔ اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ عمل نہ تو ایمان کا جزو حقیقی ہے جیسے خوارج کہتے ہیں اور نہ ایسا ہے کہ اس کو بالکل دخل نہ ہو۔ بلکہ عمل کو تحسین و ترقی میں دخل ہے البتہ اس عمل کے نہ ہونے پر مخلد فی النار نہیں ہوگا۔ گرچہ ایمان کی کمی اور زیادتی ہی ... لیکن مومن ضرور

toobaa-elibrary.blogspot.com

رہے گا

حافظ ابن حجر محدثین رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ تصدیق باللسان اقرار باللسان اور عمل بالارکان کو ایمان کہتے ہیں اور احناف اور جمہور متکلمین کے نزدیک صرف تصدیق بالجنان کا نام ایمان ہے۔ البتہ اس پر دونوں کا اتفاق ہے کہ مومن کی نجات ہو جائے گی۔ وہ جب بھی ہو یہ شرط نہیں کہ مرتے ہی جنت میں پہنچ جائے

خلاصہ یہ ہو کہ اہل سنت کے ہاں ثمرات میں اختلاف ہے البتہ احکام میں اختلاف نہیں اہل سنت و الجماعت کے ہاں بالاتفاق مومن عاصی جنت میں کبھی نہ کبھی چلا جائے گا خلود فی النار نہیں ہوگا دنیا میں ان پر مسلمانوں جیسے احکام جاری ہوں گے۔ یہ حکم جو درجہ معتبرہ ہے درمرحلہ کے خلاف ہے جمہور محدثین اکثر سلف اور ائمہ مجتہدین میں سے اکثر ائمہ کے نزدیک ایمان قول و عمل اور اعتقاد کا نام ہے یا قول میں تعمیم کی جائے یا عمل میں تو تصدیق بالجنان کے مجموعہ کا نام ایمان ہو

حنفیہ کہتے ہیں کہ ایمان فقط تصدیق اور اقرار کا نام ہے، مگر عمل جزو نہیں۔ لیکن یہ عمل کا حصہ نہ ہو، یہ ناقلین کا استدلال ہے۔ امام صاحب سے منقول نہیں تو جب ان مذاہب کو شمار کیا گیا تو ابن قتیبہ نے اس غلط کو دیکھ کر حنفیہ کو بھی مرجئہ میں داخل کر دیا حتیٰ کہ شیخ عبد القادر جیلانی نے بھی مرجئہ میں شمار کر دیا ہے اگر محض عنوانات پر حکم لگایا جائے تو پھر محدثین بھی معتزلہ میں داخل ہوں گے

اور یہ بھی معلوم ہو کہ احکام میں اختلاف نہیں بلکہ عنوانات میں اختلاف ہے قرآن مجید میں کئی آیات میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اعمال کو ایمان میں داخل نہیں کیونکہ اگر ایمان مجموعہ کا نام ہو تو اس کا محل کیا ہوگا۔ اگر محل قلب ہو تو پھر جوارح محل نہیں رہے گا اور ان کے ہاں ایمان تصدیق کا نام ہے اور اقرار شرط ہے تو ان کے ہاں ایمان کا محل قلب ہوگا

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔

معلوم ہوا کہ ایمان کا محل قلب ہے۔ اور احادیث میں بھی محل ایمان کے ہے۔

من كان في قلبه مثقال خردل من ايمان۔

تو قرآن اور احادیث کے ذریعہ معلوم ہوا کہ محل ایمان قلب ہے۔ تو پھر ایمان تصدیق کا نام ہوگا اس کے علاوہ قرآن مجید میں کثرت سے آیات ہیں جن سے ایمان اور عمل کا تغایر معلوم ہوتا ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اور عطف تغایر کو تقاضا کرتا ہے۔ ظاہر نصوص اسی کی متقاضی ہیں اگرچہ کہا جا سکتا ہے کہ جز کا عطف کل پر ہے۔ نیز جہاں پر اعمال کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے ساتھ ایمان کی شرط لگائی گئی ہے۔

مَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ۔

اگر عمل کو ایمان کہا جائے تو پھر وَهُوَ مُؤْمِنٌ شرط کیسے ہے گا اور بہت سے معاصی کے ساتھ ایمان کو جمع کیا گیا

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا۔

فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ۔

تو یہ بیدائی معصیت ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود طائفہ کو مؤمن کہا جا رہا ہے تو اگر عمل ایمان کا جزء ہوتا تو جزء کے انتفاء سے کل کا انتفاء ہو جاتا جیسے شجر چند کے اجزاء ہوتے ہیں۔

۵ مؤمنین کو حکم دیا جا رہا ہے کہ توبہ کرو يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تو توبہ کے لئے خطاب کیا ہے، حالانکہ وہ معصیت کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ معصیت اور ایمان جمع ہو سکتے ہیں۔

۶ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے ایک جاریہ کو دیا جس نے [illegible] آپ نے جاریہ سے پوچھا این اللہ [illegible] آپ نے فرمایا اعتقها فانها مؤمنة [illegible] تو یہ کا قرینہ تھا لیکن آپ نے اس سے عمل کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ ایمان عمل [illegible] حضرت جبرئیل علیہ السلام والی حدیث ہے [illegible] من الایمان آپ نے فرمایا ان تؤمن باللہ وملائکتہ [illegible] یہاں ایمان کی حقیقت بیان کی جا رہی ہے اس کے جواب میں آپ نے [illegible] کا ذکر کیا [illegible] اس کے بعد پوچھتے ہیں [illegible] اس کے جواب میں اعمال کا ذکر کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اعمال اور ایمان دو الگ [illegible] اس کے متعلق سوال کیا [illegible] اس کے جواب میں تغایر ہو گیا [illegible] اگرچہ [illegible] دو [illegible] کا تعلق [illegible]

[illegible]

toobaa-elibrary.blogspot.com

الغرض جب تک ایک سانس بھی باقی ہے۔ میراث کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ہی اس کی بیوی سے نکاح کیا جاسکتا ہے۔ تو یہ معلوم ہوا کہ بدن کوئی کام کر نہیں سکتا۔ بلکہ وہ لاشے کے مرتبہ میں ہے۔ جب تک اس میں روح نہ ہو۔ اگر روح ہو اور جسم نہ ہو۔ تو روح بے کار نہیں ہوتی۔ بلکہ روح کے قویٰ کام کرتے ہیں۔ البتہ روح جو کام آلات بدن سے لیتی تھی۔ وہ نہیں ہوتے۔ اور روح ہمیں نظر نہیں آتی جسم نظر آتا ہے۔

پس حدیث سے معلوم ہوا کہ اعمال ڈھانچہ اور بدن ہیں۔ کہ جن کو ہم دیکھ رہے ہیں۔ اگر کوئی یہ سب کام کرے۔ مگر اس میں ایمان کی روح نہ ہو۔ تو وہ بالکل قالب ہے۔ جیسے لاش کو آدمی کہا جاتا ہے۔ کیا منافقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نمازیں نہیں پڑھتے تھے۔ وہ زکوٰۃ بھی دیتے تھے۔ نفقات کرتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو قبول نہ فرمایا۔ ویسے کرنل لارنس کابل میں جماعت کراتا رہا۔ بلکہ بہت سے نصاریٰ عرب میں مسلمان بن کر رہے ہیں۔ سلطان نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں دو آدمی آپ کے مزار مقدس تک خندق کھودتے ہوئے جا رہے تھے آپ نے ان دونوں آدمیوں کی شکل بھی خواب میں ان کو دکھلائی تو تیسری مرتبہ انہیں یقین ہوا۔ فوج اور خزانہ لے کر مدینہ طیبہ کی طرف چلا۔ محاصرہ ہوا سلطان نے اعلان کیا کہ مدینہ کا ہر آدمی خزانہ سے اپنا حصہ لے جائے۔ سب لوگ آ گئے مگر وہ دو آدمی نہ آئے۔ تو جب وہ پیش کئے گئے تو سلطان نے کہا یہی دو آدمی ہیں۔ جو یہودی تھے۔ تو سرنگ فاروق اعظمؓ کے مزار تک پہنچ چکی تھی۔ ان کو پکڑ کر موت کی سزا دی گئی۔

الحاصل معلوم ہوا۔ کہ ایمان باطنی چیز ہے اور اعمال ظاہری چیزیں ہیں۔ مگر ہم ایمان پہ مطلع نہیں ہو سکتے۔ اس لئے دنیا میں تو منافقین پر اسلامی احکام جاری ہوں گے۔ مگر ایمان نہیں ہوگا۔ کیونکہ ایمان حقیقت ہے اور اعمال صورت ہیں۔ جزو، وکل نہیں۔ ایک اور حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غنیمت کا مال تقسیم کر رہے تھے۔ ایک آدمی آپؐ کے پاس بیٹھا تھا جسے آپ نہیں دے رہے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے فرمایا۔ واللہ یا رسول اللہ انی لاراہ مؤمنا آپؐ نے فرمایا۔ او مسلما تین مرتبہ یہی بات چیت ہوئی۔ جس پہ آپ نے فرمایا کہ کیا ہمارے ساتھ قتال کرتے ہو۔ تمام شراح حدیث یہی لکھتے ہیں کہ ایمان ایک باطنی چیز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دلوں کے احوال پہ اتنا کلام کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ آپ نے حضرت سعدؓ کی اصلاح فرمائی کیونکہ وہ تو مؤمن تھے۔ لیکن رقم کا نہ دینا۔ وہ اس بنا پہ نہ تھا۔ قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

بَلْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِهِمْ۔

تو آیت کریمہ میں ایمان کی نفی کی جا رہی ہے۔ اور اسلام کے متعلق کہا جاتا ہے تو نصوص قرآنیہ اور احادیث صحیحہ سے یہی معلوم ہوا کہ ایمان ایک مخفی و باطنی چیز کا نام ہے۔ اور اعمال جو ایمان سے ناشی ہوتے ہیں۔ وہ باعث نجات ہیں۔ اور وہ اعمال جو ایمان سے ناشی نہ ہوں تو وہ محض اعمال ہوئے۔ اس سے حضرت امام صاحبؒ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ کہ ایمان تصدیق کا نام ہے۔

امام رازیؒ نے مناقب شافعی میں لکھا ہے کہ سلف اور محدثین جو ایمان مجموعہ کو قرار دیتے ہیں۔ یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ انتفاء جزء تو انتفاء کل کو مستلزم ہے۔ تو مجموعہ کو ایمان کہنا صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ اس سے تو خوارج کے مسلک کا صحیح ہونا معلوم ہوا۔ یہ شبہ ان کو پیش آیا۔ تو پھر انہوں نے کہا کہ ہمارے نزدیک یہ اختلاف لفظی ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ اعمال ایمان کا جزء نہیں۔ یعنی نفس ایمان کا جزء نہیں اور جو ایمان کا جزء کہتے ہیں۔ وہ ایمان کامل کا جزء قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس نزاع لفظی کا قائل ہونا صحیح نہیں۔ کیونکہ یہ تو محدثین کی شان سے بعید ہے۔ چہ جائیکہ ائمہ کبار کہیں۔ چنانچہ ابن تیمیہؒ نے امام صاحب کے اس قول کو نقل کرکے کہا کہ یہ اصول کہ انتفاء جزء سے انتفاء کل کا ہو جاتا ہے۔ یہ اصول صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اجزاء حقیقیہ میں سے جس جزء کا انتفاء ہو جائے تو واقعی کل کا انتفاء ہو جاتا ہے۔ لیکن جو اجزاء حقیقیہ نہیں بلکہ اجزاء تحلیلیہ ہیں۔ جیسے انگلی بدن کا جزء ہے۔ لیکن اس کے کٹنے سے انسان مر نہیں جاتا۔ اگر شہ رگ کٹ جائے۔ تب انسان مر جاتا ہے۔ تو اجزاء کا دو قسم کا ہونا معلوم ہوا۔ کہ ایسے اجزاء ہیں۔ جن کے ساتھ کل کا تعلق قوی ہے اور بعض کا قوی نہیں۔ بناء علیہ جو حضرات ایمان مجموعہ کو قرار دیتے ہیں۔ تو ان میں سے بعض اجزاء ایسے ہیں کہ ان کے فوت ہو جانے سے حقیقت فوت نہیں ہوتی۔ اور بعض کے فوت ہونے سے حقیقت فوت ہو جاتی ہے۔ جیسے تصدیق مذکور ہے۔

بعض حضرات ان میں سے بعض ان اعمال کو بھی جزء حقیقی کہتے ہیں۔ جیسے امام احمد بن حنبلؒ نے نماز کے متعلق فرمایا ہے۔ ابن تیمیہؒ کی یہ تحقیق اگرچہ صحیح ہے۔ مگر اتنا تکلف صحیح نہیں۔ بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ جب احکام میں اتفاق ہے تو نزاع لفظی بھی نہیں۔ بلکہ اختلاف انظار کا ہے۔ امام صاحبؒ کے نزدیک ایمان کا نظریہ یہ ہے کہ دیکھا جائے ایمان اور عمل میں کیا نسبت ہے۔ اکثر ائمہ محدثین کی نظر جزئیت اور کلیت کی طرف گئی ہے کہ عمل جزء ہے اور ایمان کل ہے۔ یا جیسے شاخوں کو درخت سے تعلق ہوتا ہے۔ حضرت امام صاحبؒ کی نظر میں یہ تعلق نہیں۔ بلکہ ان میں ایسا تعلق ہے۔ جیسا درخت کی جڑ اور شاخ میں تعلق ہے۔ شاخ جڑ کا جزء نہیں۔ البتہ اس سے انشقاق ہوتا ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

تو امام صاحبؒ کا فرمانا یہ ہے۔ کہ ایمان سے اعمال کا انشعاب ہوتا ہے۔ لیکن اعمال جزو نہیں۔ تو نظریہ میں اختلاف ہوا۔ نزاع لفظی نہ رہا۔ البتہ اعمال کا دارومدار جڑ پر ہے۔ اگر جڑ قائم ہے تو شاخیں بھی شاداب اور سرسبز ہوں گی۔ ورنہ سیاہ پڑ جائیں گی۔ اسی لئے ایمان کے متعلق فرمایا گیا۔ کہ ایمان ستر اور چند شعبوں کا نام ہے۔

ادناھا اماطۃ الاذیٰ عن الطریق اس جگہ ائمہ کرام تو کہیں گے کہ یہ شعبے اجزاء ہیں۔ اور ایمان درخت ہے۔ اور حنفیہؒ ایمان کو جڑ کہیں گے اور اعمال کو شاخیں تو نزاع لفظی نہ ہوئی نظریاتی ہو گئی۔

الحمد للہ علیٰ ذلک

آج مورخہ ۲۰ صفر المظفر ۱۴۱۵ھ کو نقل مکمل ہوئی۔

AF-912

محمد عبد القادر قاسمی غفرلہ فاضل دیوبند
مکان نمبر ۲۶۹ محلہ شیر خان ملتان شہر

راقم السطور:۔ محمد عبد السلام قاسمی۔ ۲۹۲ بی۔ شاہ رکن عالم کالونی۔ ملتان شہر

۲۰/۱/۱۹۹۵ء

toobaa-elibrary.blogspot.com

طوبیٰ ریسرچ لائبریری

اسلامی اردو، انگلش کتب،

تاریخی، سفرنامے، لغات،

اردو ادب، آپ بیتی، نقد و تجزیہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

toobaa-elibrary.blogspot.com